

بس اک تجن ہر جانی..... اُمہریم

گلاس ڈور کھیل کر اندر آنے والا اپنی دھن میں آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹک سا گیا۔ وہ باہر روٹن آنکھیں نا کواری سے اس پر جھکی تھیں اور وہ زور سے ہونے والوں میں سے نہ تھا البتہ صورت حال ایسی تھی کہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لگژری آفس کی لمبی میز کے پیچھے ریو لوگ جیڑ پہ پھلے چار لمبے وہ جس صورت سے آشنا تھا وہ اس قدر بڑیکشن اپنے اندر رکھتی تھی کہ سلطان شاہ جیسا بندہ یوں بغور نکلنے پہ مجبور ہو جاتا اور نہ ہی اس سے قتل وہاں اتنی دیر دیتے وقت اجازت کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ دستک کی۔ ریو لوگ جیڑ پر براہمان فونٹی وجود اگرچہ مکمل حسن اپنے اندر سینے تھا مگر سلطان شاہ کے قدم ٹھٹھکانے کا باعث وہ لکونی نقوش سے سجا چہرہ نہیں بلکہ ان آنکھوں کی نا کواری اور قتل کی جو کہ سلطان شاہ کو دلچسپ کر دیتی تھی۔ یہی اس موی مجسمے میں تحریک پیدا ہوئی۔

”تم اندر آؤ۔“ انفر کاریم سیور تھا کہ لہینا سکرٹری کو طلب کیا گیا تھا اس اثناء میں سلطان شاہ سنبھل چکا تھا اور نہایت اطمینان و اعتماد سے چلا ہوا سنبھل کے قریب رکھی جیڑ پر بیٹھنے کے بعد اس کا بازو لینے لگا۔ کو کدو بہت خوب صورت تھی مگر مقابل بھی سلطان شاہ تھا جسے نڈھال کریوں کی کئی تھی اور نہ حسن کی۔ اس سے کہیں زیادہ حسین ترین لڑکیاں اس کی ایک جنس بر و پتہ دمویں میں ڈھیر ہونے کو فخر سمجھتیں مگر سلطان شاہ بے حد مغرور اور بے نیاز تھا نہ ہی یہ اس کی کمزوری تھی۔

”دور ملک نظر نہیں آ رہے ہو آپ کون ہیں؟“ سلطان شاہ نے اس پر سرسری نگاہ ڈال کر پوچھا۔ لہجے کی حاکمیت اور چہرے کے نقوش سے چھٹکتی رعوت نے انہیں کوئی پا کر دیا۔ زہر لی نگاہ اس پر ڈال کر جواب دیئے ہاں اندر آتی سکرٹری کی سمت متوجہ ہوئی۔

”اگر ان کی پانغٹ تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اگر میں بھول چکی ہوں۔ تب بھی تم نے انہیں میری اجازت کے بغیر اندر کیسے بھیج دیا؟“ انہن کی آنکھ نے شہنائی ہوئی سکرٹری کو مزید بولنے کے رکھ دیا۔ بھیجی سمجھنا تے ہوئے بولی تھی۔

”میڈم یہ سلطان شاہ ہیں۔ باس کے برائے پارٹنر جب جی چاہتا ہے آ جا جاتے ہیں سر سے ملے۔“ سکرٹری کی وضاحت پہ بھی اس کا مگر امو ڈھٹک نہ ہوا۔ چہرے کے زوایے بگاڑتے ہوئے بری طرح جھڑک دیا۔

”بک بک نہ کرو تمہیں پتہ چھاپا آفس میں نہیں پھر نہیں باہر روک کر مجھے انعام کیوں نہیں کیا؟“ سلطان شاہ جو اس بحث سے لاتعلقی بارہا تھا۔ بری طرح سے چوک کر انہن کو دیکھنے لگا جو نوز سکرٹری پہ برس رہی تھی۔

”جب میں تمہیں ڈسٹرب کرنے سے منع کر چکی تھی پھر۔“

”سوئی میڈم! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ سکرٹری گڑ گڑائی۔

”غٹ اپ! آئندہ تمہیں موقع کون دے گا۔“

”آئی ایم سوئی میڈم پلیز۔“ سکرٹری گھٹکی گئی۔

”ٹاؤگٹ آؤٹ۔“ انہن کے دھتکارنے پہ سکرٹری سر جھکا کر چلتی تھی کہ انہن کے پکارنے پر غم گئی۔

”اور ہاں انہیں بھی میری طرف سے یہی حکم ہے جو تمہارے لیے ہے۔“ سلطان شاہ کی سمت اٹھی اٹھا کر جس قدر اہانت آمیز انداز میں کہا گیا تھا وہ سلطان شاہ جیسے بندے کو ہتھے سے اکھاڑنے کو کافی تھا۔ اس تو عین سے سلطان شاہ کا وہ چہرہ ان واحد میں انکار کے کی طرح دیکھ اٹھا۔ پھر برساتی نگاہ انہن پر ڈال کر وہ جھٹکے سے کرسی دکھل کر کھڑ ہوا تھا۔ کہنی کی پھڑکی رنگ اور فرخ فیشتانی کی لاتعد اوٹھکیں اس کے موڈ کی واضح غارتھیں۔ اس سے قبل کہ نظری غصے کے زیر اثر کوئی انتہائی اقدام کرنا یا یک ہی ایک خیال اسے اپنے ارادے سے باز رکھ گیا تھا۔

انہن ملک کی پرسکون جمیل کی ماند زندگی میں پہلا پتھر تب طلسم پیدا کر گیا جب دھیمی دھیمی سر کوٹیاں چوگیاں اڑتے اڑتے اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔

”سنا ہے بیٹھ دور کا دیوالیہ نکل گیا ہے۔ بیٹھ صاحب تو بالکل نکال ہو جائیں گے۔ ارے وہ تو بکے جواہری بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص اس لعنت میں پڑ جائے اس کا دیوالیہ تو نکلے گا۔“ انہن ملک چوک کر گئی تھی جب اس بات کی تصدیق کے لیے بیٹھ دور کے پاس پہنچی تو انہیں اپنے ہی گھر کے بیڈ روم میں نشے میں دیکھ کر سناٹے میں رہ گئی۔

”پاپا! یہ کیا کر رہے ہیں؟“ رن غم سے گھرا ہوا تھا۔ ماما سے تھک کر باہر نہ آتے تو شاید نشے میں دھت باب سے اچھ پڑتی۔

”مالا! پاؤ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس قدر بدل گئے ہیں کہ انہیں بالکل خیال نہیں رہا۔“ انہن کا غم گھم کے باعث بندھ گیا یہ تکلیف دہ دور حال اس کی برداشت سے باہر تھی۔

”میں کیا کہوں انہن! میں خود پریشان ہوں لیکن پلیز تم اس بات کو ذہن پہ سواری مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں قحس سے کام لینا چاہیے۔“

”قحس سے کام لے کر کیا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نو ما خود بخود کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔ آپ مجھے سب کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟“ انہن کا ضبط جواب دے گیا تب ماما اس کی ضد کے سامنے ہار چکا ہوا۔ ان کے منہ سے سب کچھ تفصیل سے جان کر وہ سا کدھر ہو گئی تھی۔

”مطالب میں خود افسوس دیکھو گی حالات اس بچے پہ پہنچ چکے ہیں اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ آخر کار یہ فیصلہ کر کے وہ جیسے قحس طور پر مطمئن ہوئی تھی۔



”تم نے تو کہا تھا ساتھ جیس مر رہی گے۔ کیا ہوئے وہ وہ سب؟“ انہن میں اب چھوڑ رہے ہو مجھے اس مول پہ آ کے جب رسولی میری ذات کی دلایز پہ قدم بھر چکی ہے۔ نہیں آصف میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گی۔ تم مجھے قحس آسانی سے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

لاں کے قدم زمین نے جکڑ لیے دروازہ کھولنے کو تھا ہاتھ وہیں ساکت ہو گیا۔

”تم میری حجت اور دو کاویوں کو ہمار کر نہیں جاسکتے۔ تمہیں پتہ ہے ہم میں تمہارے۔“ آگے جو کچھ بھی کہہ رہی تھی لایں کا کمزور دل بہہ نہ پایا۔ کچھ دھک سے رہ گیا۔ بے جان ہوئے وجود کو مشکل تھک کر انہوں نے دھڑلے سے دروازہ کھلیا تھا۔ اس دھماکے پہ درخف بالوں کو کول سے جھک کر مڑی تھی۔ لایں پہ نگاہ پڑی تو منہ بگاڑ لیا۔

”کیا ہے لایں؟ کبھی تو اچھک سے آجلیا کرو۔“ لایں جو بلدی کی ماند زندگی میں رہی تھیں اسے تہا ہا کر جہاں مطمئن سی ہوئی تھیں وہیں اس کے یوں ہولا دینے پہ یک دم ہی غصے کی زیادتی سے لرزے لگیں۔

”کینی نامر اوتو نے مجھے ڈرا ڈالا۔ اری میں کبھی کون اونڈا لپاڑا گھر میں گھس آیا جس سے تو راز و نیاز کر رہی ہے۔“

درخف کے قحس میں کڑواہٹ گئی آنکھیں غصے کی زیادتی سے سلگنے لگیں۔ لایں اس کے غصے سے بے نیازی موڈ میں بولے جاری تھیں۔

”تیری اداکاری کا یہ شوق مجھے لے ڈوبا جانے کیوں دیوانی ہوئی جاتی ہے۔“

”لاں بس بھی کریں سارے مزہ خراب کر دیا کتنی اچھی ہوگی یہ میری ڈائلاگ ڈیلوری اور جہاںے دلوہے کے تار نے لگیں۔“ اس کی بات پہ لایں کا پارہزید چڑھ گیا۔

”تھیر بد ذات تجھے میں بتاتی ہوں۔“ انہیں جھک کر چپل اتار تے دیکھ کر وہ کچ بولکرائی۔

”تھیر وہاں بات تو سن لو۔“ ان کا وار چاتی ہوئے نہ چلا تے ہیں بولی لایں کا کھنچ کر مارا ہوا جوتا اس کے داہنے شانے کی خبر لے گیا۔



سلطان شاہ ہال اینڈ اینڈ نم تھا غصہ کی ڈیر منگ نے سے مزید پر نشش بنا دیا تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا پورا پورا احساس تھا۔ جمعی تو چال میں غور نہ ہاں تھا۔ یوں اکثر کر چلنا جیسے کسی ریاست کا شہر اور وہ چہرے کے خدوخال سے رعوت چھٹکتی تھی۔ لہجہ تھکانا ہوتا آنکھوں سے عیب سی سر بھری تو فخر کی شعاعیں نکل کر مقابل کو اس سے خائف اور سہمے رہنے پر اکساتی تھیں۔ اس کی ایک ایک جنبش سے بے نیازی لاپرواہی کا تاثر چھٹکتا تھا۔ مالدار تھا۔ کسی شے کی کمی نہ تھی پھر برائیاں کیسے اس کی ذات سے وابستہ نہ ہوتیں۔ اس کی چار منگ شخصیت میں جانے کیسا حیرت انگیز لڑکیاں اس کی ہر جانی فطرت کو پار بھی دیون اور تار ہوا کرتیں یہ سب تھا اس کے باوجود انہن ملک وہ اوجھڑکی تھی جس نے اس کے بے نیاز احساسات کو کیا بے دردی سے جھجھوڑا تھا۔ تب سے وہ ایک بل کے لیے بھی انہن ملک کو ذہن سے نکال نہ پایا تھا۔ وہ صرف وہ انسان تھی جو دانستہ یا نا دانستہ انہن ملک اس کی کر چکی تھی۔ اور سلطان شاہ عاف کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ انہن ملک اس کی اسٹ پر پہلے نمبر پہ آ چکی تھی۔ سیاہ آنکھیں آلوینک گیٹ وہاں تھا اور وائٹ لینڈ کر رور پور ٹیکو میں آن رکی۔ وائٹ کاشن کے کھڑکھڑاتے شلوار سوٹ میں سلطان شاہ آمد ہوا تھا۔ خادم حسین پور ٹیکو سے لایں کے رستے اندر جاتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے آتے خادم حسین کو پکارا۔

”جی سر کار! حاضر۔“

”جو کام تمہیں سونپا تھا کہاں تک پہنچا؟“ شان سے گردن اڑاتے زمین روندنا ہو لوہر کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔

”سر کار آپ کے حکم کے مطابق جلد نکال ہو جائے گا۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے بلکہ دو تین ہاتھ لڑ چھ بھی گئے ہیں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ انتظار کریں سرکار۔“ اس کے قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش میں خادم حسین باقاعدہ دوڑ رہا تھا۔

”اوکے گڈ روم۔“ اس نے نطوت سے سر ہلایا اور ہاتھ سے اسے اپنا کام کرنے کی اجازت دی یہ اس بات کا اشار تھا کہ اب اسے خادم حسین کی ضرورت نہیں اور خود اسی رفتار سے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا جبکہ خادم حسین رک کر سانس بھال کرنے لگا تھا۔



”کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟“

کب آئے گا؟ آگے میرا نڈا جائے گا

اس شہر او سکے میں رہ لکوں

ذیک فل وایوم میں چل رہا تھا درخف رائل بیلیو سا مچی پہنے بال کھراے لہر لہر کر چکی مقلتی خود بھی ساتھ ساتھ گنگنار رہی تھی۔ لایں نے بڑی ہٹاتے ہوئے برآمدے کی کھڑکی سے اسے آٹھی لگا ہوں سے گھور گھور پوری طرح گنگن تھی۔ چھری ڈو کی میں بیچ کر لایں مشتاق ہوئی اندر آئیں اور بڑھ کر ذیک کا سوجھ کھنچ دیا۔ میوزک جیسے ہی کو اس کا جسم بھی ساکت ہو گیا۔ لایں پہ نگاہ پڑتے ہی پہلے جھپٹی جھپٹی بگاڑتے ہوئے بولی تھی۔

”اماں! کیوں ٹیپ بند کیا! اتنا تو مزہ آ رہا تھا۔“

”اربی کو کم جنت‘ بخجے شرم نہیں آتی۔ دیوید کی جیامرگنی ہے تیری کہاں کے سامنے، جتنی ہے۔“ لہاں نے اپنے تہیں اسے غیرت دلا نا چاہی مگر وہ نہجھے سے اکھر گئی۔

”کو کیا ہوا لاس! میں تو تمہارے سامنے جا چکی ہوں اور جو تمہاری لادنی سچوتی ہے وہ تو ہزاروں کے ٹھمے کے سامنے بے حیائی سے اپنا آپ دکھائی ہے۔“ اس سے پہلے کہ درخ کی زبان مزید ہڑنگتی لاس کے ہاتھ نے حرکت میں آ کر زمانے کا تھپڑ اس کے دہانے لگال پر دے مارا تھا۔

”مجبوری اور مشق میں فرق ہوتا ہے۔ اتنی تھی جب تیرا پیر مارا کون کھلانا اگر وہ گھر سے نہ نکلی تو اس کی دشمنی ہو رہی ہے۔“ ملاں غلامی تھیں۔ درجنف اس حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ اپنی جگہ وہ بل کر رہ گئی تھی۔ حیرت رنج غیر یقینی سے ویڈیائی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”تیرے دیدوں کا پانی ختم ہو گیا گوشتی کیسے منہ چھار کے ہوئی، بہن کی بات کرتی ہے۔ ہانڈی جو لمبے سے تجھے رغبت نہیں لڑکیوں والا کوئی شوق نہیں لے کے کھڑا بنادیا گھر کو ٹھیک ہے تو نہیں سدھر نے کی۔ کرتی ہوں تیرا احترام۔“ ماں غصے سے لال پیلکی ہوتی بکتی بچھتی محسن میں جا کر سبزی ہانے لگیں جبکہ درجنف غصے سے کھولتے ہوئے مسلسل بوڑھاری تھی۔

”ہاں میں ہی فالتو ہوں جو گھر سنبھالوں چولہا جھونکوں لو بیتاؤ لے کے کھڑ مرادیا۔ سن اولیاں مجھے یہاں نہیں مرنے میں ضروری قلموں میں کام کروں گی یاں آخر اتنا سن گھر میں ملتی چولہا کر کے گہنا تھوڑی ہے۔“

اب وہ آنے کے سامنے کھڑی اپنے لکڑی فروش سے حق بیچ کر کے کوڑھڑی تھی جبکہ لالہ یوں بلان بند کے بیٹھے تھے جسے کچھ سناں نہ دے رہا ہو۔



دعویٰ ملک کا اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے سلطان شاہ نے کہا۔

١٢٣٤٥٦٧٨٩١٠١١١٢١٣١٤١٥١٦١٧١٨١٩٢٠٢١٢٢٢٣٢٤٢٥٢٦٢٧٢٨٢٩٣٠٣١٣٢٣٣٣٤٣٥٣٦٣٧٣٨٣٩٤٠٤١٤٢٤٣٤٤٤٥٤٦٤٧٤٨٤٩٥٠٥١٥٢٥٣٥٤٥٥٥٦٥٧٥٨٥٩٦٠٦١٦٢٦٣٦٤٦٥٦٦٦٧٦٨٦٩٧٠٧١٧٢٧٣٧٤٧٥٧٦٧٧٧٨٧٩٨٠٨١٨٢٨٣٨٤٨٥٨٦٨٧٨٨٨٩٩٠٩١٩٢٩٣٩٤٩٥٩٦٩٧٩٨٩٩

”ارے اتنی جلدی۔“ سلطان شاہ نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا پھر خادم حسین کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ خادم حسین بکلی کی تیزی سے حرکت میں آیا اور اگلے ہی لمحے بہترین شوق گلاس میں نازل کر دیو ملک کے ہاتھ میں گلاس زیرِ دقت چھاندا۔

”میں نے جناب“ زبردستی ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر صوفے پر ڈھکلتے ہوئے خادم حسین نے مالک کے عظم کی تعمیل میں لمبھڑ کی ہاتھ خیر نہیں کیا۔

”دور ملک ایہ آخری داؤ ہے گا دیم ہو سکتا ہے اس بات پر جیت جائیں۔ یہ ایسا کھیل ہے کہ کچھ کہا تو نہیں جا سکتا۔“ سلطان شاہو نے کی بیک سے ٹیک لگائے تاکہ یہ ٹانگ جڑھ جائے بہت لاروا لنداز میں اس کے سامنے تھا۔

”مگر میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا۔“ داور ملک نے بڑا اگھوٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ چہرہ دپتے دپتے میں ڈوب رہا تھا اور آنکھیں نشے کے باعث بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں۔

”اوو سینٹھ صاحب! اب ہم سے کیا پردہ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ شروع کریں پھر۔“ سلطان شاہ اس جنگل کا گھاگ ڈکاری تھا جبکہ سینٹھ داور نیا پنچھی تھا! آسانی اس کے جال میں پھنس گیا مگر اب واقعی وہ خالی تھ تھا۔

”نہیں یقین مانو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ (اور ملک نے تماشہ منے کے باعث جھومتے ہوئے بولے۔

”نہری معلومات کے مطابق ابھی آپ کو امر سٹیز بورڈ آف انٹرنیشنل ٹریڈ کے بارے میں“

”ہاں ہاں۔“ سیمٹھو کوڑ نے زور دھند سے سر ہلایا۔ ”یہ میری آخری پوچھی ہے۔ میں اب نہیں کہلیں گا۔“ زور ملک نے فٹے کے باوجود اس پر حملہ کر رکھے تھے۔ سلطان شاد نے گھبراہٹ سے انہیں دیکھا تھا مگر کچھ نہ کہنے لگے۔

”ہو سکتا ہے اب کی بار آپ جیت جائیں۔ میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے ہیں۔ بیوسر اسر بڑول ہے۔“ اس نے دواور ملک کی سوئی ہوئی غیرت پٹا زینہ مارا۔ ”کیا لگا میں گرا ہے؟“ سلطان شاہ سیٹھی دواور اس کی توقع کے عین مطابق اس جذباتی ملک مہلک میں دھر لے گئے۔ سلطان شاہ کے ہونٹوں کی تراش میں فاتحانہ مسکراہٹ رہ جگ لگی۔

”چلیں اگر میں ہار تو ایک کروڑ روپے آپ کو دے گا آپ ہار کر بزنس سے دستبردار ہو چکے ہیں، آپ کے حقینے کی صورت میں پور بزنس آپ کا ہو جائے گا۔“ اس نے ہم سب کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”او کے کوکے لگاؤ پھر“، سید محمد اہر کی یہ سنت ہے با جھیں مکمل گئیں۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو اشارہ کیا تھا۔ خادم حسین نے کافو س سے کوئی نکال کر دیو اور میں ڈالی تھی پھر جیمبر گھما کر دیو اور سلطان شاہ کو پیش کر دیا۔ ”لیجئے سر۔“

”نہ کہہ سکا کہ رے ہو؟ مجھے کرو چل جائے گا۔ کوئی سے اس میں“۔ دکنور ملک کو لوں اچھل کر بچتے تھے وکھ کر سلطان شاہ نے سفارتیہ متہنگہ گانے لگا۔

”تم آں سیدھے صاحبِ اہلِ ریم و زمینِ یہ سانپ کچھ نہیں ہے۔“ انہیں زبردستی دیکھ کر وہ ہلکی روک کر ہوا۔

”اب کیا رہا رحمت کا فیصلہ یہ ریوالور کرے گا بیٹھ صاحبِ باجیت ورنہ موت۔“ اس نے ریوالور ان کی کمر میں جھپکتے ہوئے سفاکی سے کہا۔ شیخہ دلو کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”او کے ذہن ورنہ سلطان شاہ نے انہیں سر دہڑے تو کچھ رکھا ہمت کی اور اختیار کی۔“

”ابھی موت ہے۔“ اس نے روکھائی سے کہتے ہوئے بھینٹ کر دیو اور پے قبضے میں کر لیا۔ دیو ملک کی آنکھوں سے واضح بے بسی چھلکی گئی۔

اس طرح کے انتہائی بھونگٹاؤ نے وجان ابو کھیل کھیلکے خادم حسین یوں ہی مے قرارے کل سا ہو جانا۔ اس وقت بھی مارے خطرے کے چپ نہ رہا۔

”مہم سرکار۔“ وہ گڑگڑایا اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ایک کو خادم حسین کا یہ ہستراض ہمیشہ کی طرح گراں گزرے گا اور وہ اب بھی حسب سابق بری طرح ڈانٹنے کے لگام روہ اپنے دل کا کیا کرتا۔ جواب نے سرکار سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بے غرض محبت۔ خادم حسین تو اس کے ایک اشارے پہ جان بوار سکتا تھا۔ پھر اسے موت سے کھیلنے کیسے دیکھ لیتا۔ سلطان

شاہ جوہا اور گنیشی پر رکھ چکا تھا خادم حسین کی حاجت بھری مداخلت پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ خادم حسین نے گردن اٹانے کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے حکم کریں سرکار میں کر لوں۔“ خادم حسین نے بڑی سے گھٹکھٹا کر بولا جواب میں سلطان شاہ ایک سر دھکا اس پر ڈال کر بے نیاز نہ گیا مگر اس ایک ٹکے نے ہی خادم حسین کو

”وہ“ سلطان شاہ کی اہلیہ بیان بھری آواز سن کر دوبارہ ملک نے شدت سے فائر ہونے کی دعا مانگی۔ ”لو“ خادم حسین نے دونوں ہاتھ جما کر کانٹوں پر رکھے اور انکھیں سخت سے

بند کر لیں۔ اب دو گڑ گڑا کر رب سے سلطان شاہ کی خیریت کا مطلب ہو گیا۔ دوسرا ملک پسے میں ڈوبنے لگے۔ فطرتی تبدیلیاں ماحول سے پسینہ پونچھا۔ ”تھری۔“ اس کے ساتھ ہی سلطان شاہ نے زنگریا دیا اور لورداور ملک جو ایک کانوں کو پھاڑ دینے والا دھماکہ سننے کے شہر تھے صد سے کی زیادتی سے جیسے ڈھمکے گئے۔ سلطان شاہ فاتحانہ

مسکراہٹ لیں۔ چہ جائے کہ گھر باہر سے بھر پور ملاحظہ ہو رہا تھا ایک گہرا اور طویل سانس خادِم حسین کے پیچھے دوں سے آ کر نہوا۔ خوشی کے باعث اس کا چہرہ دھچکنے لگا۔

انہوں نے خود کو منجانب انا چاہتا۔ کیسے سامنا کروں گا میں اپنی ٹٹلی کا لہر دینا لے لے مجھے..... اف کیا غلطی ہو گئی۔ دہلیور ملک کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا۔ سلطان شاہنشاہ یہ ہنسا تو ہنسا چلا گیا۔ اس کے برعکس دہلیور ملک جیسے موت کا پر واز ہاتھ میں لیے قریب ارگ تھے۔ سلطان شاہ کی ہنسی تھمسی تھی۔ اسے رتی برہم بھی دہلیور

ملک کی پریشتی کا احساس نہ تھا جو شدید اضطراب کا شکار مسلسل پہلو بہ لیتے ہوئے اب گہرا اس کے اگلے اقدام کے منتظر تھے۔ سلطان شاہ کو منہ سے نظموں کے الفاظ پہ ان کی آئندہ زندگی کا وارید اترتا۔ خادم حسین ہر شے بے نیاز بہت مٹھی بوریار بھری نظروں سے سلطان شاہ کو تنکے جا رہا تھا۔ جبکہ سلطان شاہ نے ایک بار بھی اس پر نظر

”اس کرائس چویشن سے اگر آپ چاہیں تو کھل بھی سکتے ہیں۔ آئی مین دوور امرتہ بھی ہے۔ یعنی آپ کا بھگتہ لوگاڑی آپ کے پاس رہ سکتی ہے۔“ سلطان شاہ نے بہت

اہمیان سے اپنے مقصد کی جانب آتے ہوئے دکنور ملک کو چوکے پہنچو کر دیا۔ دکنور ملک جو ملکست خوردہ اور ہندو مال سے گردان بنوڑائے ہوئے تھے جھکے سے سیدھے ہو گئے۔

”یومر اراستہ کیا ہے؟ جلدی بناؤ۔“ ان کی بے قراری و جوش دیکھنے سے تعاقب رکھتا تھا۔ دل یکبارگی شوقوں سے دھڑک اٹھا کیا ایسا ممکن ہے کاش اس بار میں جی جاؤں! آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ انہوں نے دل ہی دل میں عہد باندا ہوا امید بھری نظروں سے سلطان شاہ کو دیکھتے گئے۔ داور ملک کا خطر اب انتہا کو پہنچا جب وہ بھاری لہجے میں ان

”لوہور ملک! آپ کی ایک جٹی بھی تو ہے کیا؟ ام ہے؟“ اس نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے پیشانی پر مسل کر کو بیٹا دکر نے کی کوشش کی۔

”ایسا۔ ایسا۔“ داور ملک نے جلدی سے یہ مشکل آسان کرتے ہوئے کسی قدر اچھے سے لے دیکھا۔ ”مگر اس کا یہاں کیا ذکر؟“ اب انہیں غصہ آنے لگا یہ کم بخت جان بوجھ کر میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ جھلکا کر سوچے لگے تھے۔

”اوہ ہاں شاید ایجن۔“ سلطان شاہو نے سر اثبات میں پلایا۔

”دور ملک آپ کی گاڑی پور بنگلہ آپ کے پاس رہ جائے گا۔ امین ملک کو مجھ سے دیں۔“ دور ملک کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے اطمینان سے مدعا بیان ہوا۔ دور ملک جھونچکے سے آنکھیں پھاڑے جیسے اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔



فل ڈننگ کی شرٹ کے ساتھ چڑی پا جامہ زیب تن کیے پشت پہ بالوں کا آئینہ رگڑا کرے دو پہنہ سنبھالتی سچ سچ چلتی وہ جیسے ہی باہر آئی لائے کے پاس خالد ثریا کو بیٹھے راز و نیاز میں مگن دیکھ کر تمس کی رنگ پھڑک اٹھی۔ لائے خالد ثریا سے سرکشوں میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھا تو خالد کو بوا کا مار کر خود بھی خاموش ہو گئیں۔

”در نجف! اوہ آ۔“ لائے کے بلانے پہ وہ ہلک جھپک چٹکی لگی۔ اس روز کے صبح کے بعد سے لائے نے بول چال بند کر رکھی تھی۔ صلح کا پیر چم لہرانے کی اس نے بھی ضرورت نہ سمجھی کہ اس طرح اس کے اپنے پیش تھے۔ امیر (بڑی بہن) کے ملازمات بہن کر سارا لون ایکٹنگ کا شوق پورا کرتی۔ کبھی کبھار واک کرتے ہوئے خوش ہوتی۔

”ہائے لائے۔“ نزاکت سے دو پہنہ سر پہ نکاتے ہوئے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس وقت وہ راتیر درانی کا بہرہ دہ بھرے تھی۔

”یہ کیا گھر میں بھی اسی طرح سولہ گھار کیے رکھتی ہے؟“ خالد ثریا نے اس کے بالوں میں اگلے موٹیے کے کجروں اور فل ایک آپ کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ خود کو اٹھرا مٹائی جبکہ لائے سخت بد مزہ ہونے کے ساتھ شرمندہ منہ دکھائی دینے لگیں۔

”نہیں آج تو اس کی سہیلی کی سالگرہ ہے۔ وہیں جانے کو تیار ہوئی ہے۔“ جھوٹ بولتے ہوئے انہیں غاصی وقت کا سامنا کرنا پڑا مگر اولاد کی خاطر بہت سے پل صبر لٹا کر نے پڑتے ہیں۔ اب انہیں کچا بنا کر کتنے ابھیرے کھاتے سے کیے گئے تھیں۔ البتہ در نجف کو آنکھوں سے تنبیہ کرنا نہیں بھولیں۔ کیا کچا اگلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی جانے کس موڈ میں تھی چکی رہی۔

”ہائے اس طرح نی سنو ری بھی رتی ہے تو خیر ہے۔ اب دور بدل گیا بہن! لڑکے اسی طرح کی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ پھر اس پوٹو اٹھاپننا چتا بھی ہے۔“ خالد ثریا کی تعریف نے در نجف کی باپ جھپک چڑ دیں۔ جتنا کچا وہوں سے لائے کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ایک آپ نہ مانیں تو کیا وہ دنیا تو میرے حسن کو مانتی ہے۔ لائے اس کی سکر ہٹ پہ کلس گئیں۔ جیسی اسے اٹھاتے ہوئے بولی تھیں۔

”چل اٹھ جا چائے بنالا خالد کے لیے۔“ در نجف کوئی اور وقت ہوتا پٹ سے انکار کر دیتی مگر ابھی ابھی خالد کے منہ سے یہی تعریف کا نشہ مار بن کر چھلپا تھا۔ جیسی اسی سرخوٹی کے عالم میں اٹھ گئی۔

”بہن میں اللہ کی کوئی گئی۔ تمہاری بیٹی بھی خوب صورت ہے مگر لڑکا تو بہت ہی خوب ہے۔ دیکھنے میں ٹھیک اومگتا ہے۔ ایسا شیر جون کہہ دیکھتے ہی دل خوش ہو جائے۔“ یقین مانوں اب تک ہزاروں رشتے کروائے مگر ایسا لکا چلا لڑکا کبھی نہیں دیکھا۔ تمہاری بیٹی کا تو نصیب روشن ہو گیا۔ چارم میرے ساتھ۔ یہ منہ کی بات نہیں دیکھ کر تم خود یقین کر لیتا۔“ خالد ثریا جوش سے بتاتے ہوئے آواز کو ایلوم بھی بڑھا گئی تھیں جیسی در نجف کے کانوں تک با آسانی سب کچھ پہنچ گیا۔



”کیا آپ نے اپنی بیٹی جوئے میں باندھی۔“ ملا شاک میں گھر کر آئیں دیکھنے لگیں۔

”شٹ اپ بیگم میں نے امین کو جوئے میں نہیں باریکد اس کا رشتہ سلطان شاہ سے ملے کیا ہے۔“ دور ملک اس قسم کی صورت حال کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔ بنا گھبرائے اطمینان سے بولے۔

”ہائے آپ تو یہ ہی کہیں گے۔“ لائے نے زیر خند سے جواب دیا۔

”زیادہ بکواس نہیں کرو نہیں نے تمہیں جھگڑا کرنے کو نہیں بلایا۔ جا کر امین کو بتا دو۔“ دور ملک نے رکھائی سے جواب دیتے ہوئے وارڈ روپ سے اپنے کپڑے نکالے اور پلٹ کر دیکھے بنو اش روم میں گھس کر دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

ملا وہیں سرخام کے بیٹھ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ امین مر جائے گی مگر کبھی راضی نہیں ہوگی۔ کور سے راضی ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ایک جواہری کے ہاتھوں کھلونا بننے سے بہتر ہے وہ ایک ہی بار موت کو گھٹک لے لے ایسے شخص کا کیا بھروسہ کل کو وہ بھی جوئے میں اسے ہار دے۔ اگر باپ نے خیال نہیں کیا تو ایک غیر آدمی کو کیا پروا ہے اپنے خیال نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔

”ملا! میں شانزے کے ساتھ جاری ہوں۔ یونیورسٹی بھی جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رہ جائے۔ آپ پریشان مت ہوئے گا۔“ جاتے جاتے امین نے انہیں آگاہ کیا تھا مگر ان کے اندر اناشتہ نے چونکا دیا۔

”ملا! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ قدم بڑھا کر قریب آتے ہوئے اس نے پریشانی میں گھر لو کچھ کر استفسار کیا تھا۔ ان کا چہرہ دھوپر اٹھاتے ہی ہری طرح چونک گئی۔

”ملا! این پراہلم! کیا ہوا ہے؟“ ان کی زور رنگت نے معاملے کی سنگینی کا راز فاش کر دیا۔

”ایسا میری بیٹی تمہارے پیانے۔“ بولتے کرنے کی آواز پر وہ گھبرا کر بات پوری کیے بنا ہی خوفزدہ نظروں سے عااش روم سے برآمد ہوتے دور ملک کو دیکھنے لگیں۔ جیسے چوری کرتے ہوئے رگتے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔ امین نے ان کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا پھر گہرا سانس کھینچ کر دوا روم کی سمت متوجہ ہو گئی۔

”ملا! آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”کچھ نہیں کہہ رہی تھی یہ تم جاؤ۔“ دور ملک نے ہا کوری سے مداخلت کرتے ہوئے امین کو جانے کا اشارہ کیا۔

”بٹ پاپ۔“

”بٹ نہیں کرو امین! جاؤ تم۔“ انہوں نے ذات کر کہا۔ امین تذبذب کا شکار ملا کو دیکھتے ہوئے پلٹ کر چلی گئی۔ اس کے نکلنے ہی داور ملک چپے کی سی تیزی سے ان پہ چھپے تھے۔

”کیا کرنے جاری تھیں۔ بہت ہمدردی کا بخار چڑھ رہا ہے تمہیں۔ ایک بات یاد رکھو۔ صرف تمہاری نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ بچا نہیں میں نے اسے۔ سلطان شاہ بہت ڈیپنٹ آدمی ہے۔ خوش رہے گی وہ۔“ اس کے ساتھ ان کے بال ٹٹھی میں جکڑ کر زوردار جھک دیتے ہوئے دور ملک نے ان سے زیادہ کیا خود کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

پھر مزید بولے تو لپچے میں سرخوٹ ہو آئی تھی۔

”اگر تم نے کچھ بھی غلط کیا تو یا در کھنا میں طلاق دے دوں گا تمہیں۔ سمجھیں؟ امین کو اس معاملے کی کو بھی نہیں لگنی چاہیے بس یہ بتا دو کہ اس بھلے کو اس کا نکاح ہے۔“ دھکانے کے بعد وہ قن فن کرتے کرے سے نکتے چٹے گئے تھے۔



”لائے! اکل تم لو کہ دیکھنے لگی تھیں؟“ خلاف توقع پاس بیٹھ کر سر میں ذاتی تیل لائے سے کنوری پکڑتے ہوئے خود ماش کرتے ہوئے اس نے معصومیت سے سوال کیا۔ لائے نے ٹھٹھک کر اس کی صورت دیکھی۔ البتہ اسے فرما نہ سمجھتے ہوئے جواب دینا ضروری خیال نہ کیا۔

”لائے! مجھے بھی ساتھ لے جاتیں نا۔ میں بھی دیکھ لیتی موصوف کتنے خوب صورت ہیں۔“

”دھت تیرے کی۔“ لائے کے ہاتھ سے تیل کی بوتل چھوٹ گئی وہ بے حیا تھی کہ اس قدر لائے کو شاک نہ تو ہوا ہی تھا کیسی بے غیبتی سے لپچے ہوئے ولے دہا کو خود دیکھنے کی خواہش ظاہر کر رہی تھی۔

”چل دفع وہاں سے۔“ لائے نے فرش پہ پھیلے تیل کو نظر نہ اڑ کر کے خود کو نظروں سے اسے گھورا۔

”کیا ہے لائے! کبھی تو بیارے بول لیا کر۔ اب ایسے کیا آنکھیں نکال رہی ہو۔ اس میں قیامت ہی کیا ہے۔ آخر آسید آپا کا دلہا دیکھنے کی میری فرمائش ہے جاؤ نہیں۔ سالی ہوں میں اس کی۔“ اگلی بات نے لائے کے چٹکے چھڑا دیے تو یہ سمجھ رہی ہے ان کا جی چاہا پنا سر بیٹ لیں۔ آخر وہ کس جہاں میں گم رہی تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو لڑکے کے دھتے دار آ کر بات پکی کر گئے تھے۔ انہیں شادی کی جلدی تھی جبکہ لائے کو ان سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ لہذا انکار کا جواز ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے در نجف کے ہاتھ پہ پیسے رکھے تھے اگرچہ آسید بھی موجود تھی۔ مگر لائے نے خشکیوں سے بڑی کو گھورا۔

”بات سن۔ شادی آسید کی نہیں تیری ہو رہی ہے۔ اب اس خموس اداکاری کو بھول جا اور بیاہ کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹا۔“ بال سمیٹ کر لائے اندر چلی گئیں۔ جبکہ در نجف کو یا دیکھنے کو لکوں پہ جا پڑی۔ بہت دیر لگی تھی اسے خود کو سنبھالنے میں اور جب خواص بحال ہوئے تو دونداتی ہوئی لائے کے سر پہ پچھتی تھی۔

”کیا تمام میری شادی کر رہی ہو۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ سن لو مجھے فلموں میں کام کرنا ہے، بس۔“

لائے پہ مطلق اثر نہ ہوا ہے پرواہی سے کس کھولے ہوئے کپڑے سے لیے اور زیورات نکال کر دیکھتے ہوئے خوش ہوتی رہیں۔ ان پہ اپنی بات کا اثر نہ دیکھ کر وہ جیسے سلگ اٹھی۔

”میں آگ لگا دوں گی ان سب کو بھی اور تمہارے اس سر کو بھی۔ خبردار لائے جو میری شادی کا نام بھی لیا۔“ وہ جیسے دیوانی ہو گئی۔ زرق برق جوڑے لٹھا کر بچکے ہوئے چٹچ پڑی۔ لائے نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”کیا کرے گی تو۔“ ہائے کیا کر سکتی ہے۔ اسے باؤلی ہوئی ہے۔ مراد بہت بیار اچھے ہے۔ بہت پیار ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔“ اسے آنسو بہاتے دیکھ کر غصہ کرنے کے بجائے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”جھاڑ میں جائے وہ مجھے نہیں چاہیے ایسا ہی بیار ہے تو آسید آپا کی کرو۔ لائے میری نہیں اور سن لو اگر تم نے اب بھی میری بات نہیں مانی تو میں گھر سے چلی جاؤں گی۔“ اس نے جس قدر اشتعال سے جواب دیا تھا۔ لائے ٹھٹھک سی گئیں وہ اتنی بد لحاظ اور سرکش تھی کہ ایسا قدم اٹھانے سے کبھی نہ چوکتی۔ لائے نے خاموشی میں حافیت جانی اور چپکے سے اٹھ کر باہر آتے ہی دروازے کی کنڈی لگا دی۔ در نجف تو جیسے غم پنا گل ہو گئی۔ جیتنے ہوئے دروازہ دھڑ دھڑاتی رہی مگر لائے کانوں میں تیل ڈالے اپنے کام میں مگن ہو گئی تھیں۔



ڈیرنگ ٹیبل کے آگے میں سلطان شاہ کا بھرپور وجاہت لیے شاندار عکس جھللا رہا تھا۔ سیاہ سوٹ پہ سرخ مٹائی نے چہرے کی سرخ و غید رنگت کو مزید پرکشش بنا ڈالا تھا۔ بال

برش کرتے ہوئے تنقیدی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیتا وہ جانے کس سوچ میں تھا کہ آنکھوں میں واضح سکریمٹ تھی۔ خادم حسین پر قیوم کی بولی پکڑے گھوم گھوم کر فراخ دلی سے اس پر سانس پڑھ کر رہا تھا۔

”اب تم جاؤ خادم حسین۔“ سلطان شاہ ہاتھ اٹھا کر ٹوکتا ہوا اور برش ڈریسنگ ٹیبل پہ اچھال دیا۔ خادم حسین نے سر تسلیم خم کیا۔ اور بولی ٹیبل پہ سجا کر سرعت سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔ سلطان شاہ کا نئی پیرسٹ وائچ باغیچہ اور باغیچہ دروازہ اوپن کر کے ایک باز کھانڈ لکھ لکھ کر اندر آئی تھی۔ سلطان شاہ نے کچھ بھی ڈانٹا کو رائنڈ کیا جبکہ وہ کچھ بھی کہے بنا اس کے قدموں کے نزدیک کارپٹ پہ دوڑا تو ہوا کر بیٹھے کے بعد اسے موزے اور جوتے پہنائے گئی۔ ”اسلمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ خادم حسین کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔“ فریخت حاصل کرنے کے بعد اب دوسرا ٹھکانہ بہت چھلکے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ سلطان شاہ کا زویہ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

”وقوف اجڑ عورت۔ اگر وہ ٹھیک نہیں تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ سان سٹس۔“ اس کا لہجہ بے حد نرم ہو گیا۔ زویہ ہم کر رہی تھی۔

”ہو رستے سے۔“ پاؤں سمیٹتے ہوئے وہ بھر پور تلی سے بولا تھا۔ زویہ پہلے ہی ٹپٹا چکی تھی گڑبڑا کر پیچھے ہٹے ہوئے دیوار سے جا لگی۔ سلطان شاہ موبائل اٹھا کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ ”خادم حسین“ برآمدے کی بیڑیاں اترتے ہی اس نے مخصوص انداز میں پکارا۔

”حاضر سرکار۔“ خادم حسین بولی کے جن کی طرح حاضر خدمت تھا۔

”کریم بخش سے کبوا اسلمہ کو لکھ لکھ لے جائے۔ اگر سیریس مسئلہ ہو تو مجھے فون کر دے۔“

”جی سرکار۔“ خادم حسین سر ہلا کر اس کا اشارہ ملتے ہی پلٹ گیا جب کہ سلطان شاہ کے قدم پور لٹکوں کی سمت اٹھ رہے تھے۔



کتنی ہی دیر تک تو اسے اپنی ساتوں پہ مشغول ہوا تھا۔ مگر جب ملانے دیا رہا۔ بار کا تپ وہ بھی بھٹی آنکھوں سے انہیں کتنی ہوئی غیر یقینی سے بولی تھی۔

”لما کیا کہہ رہی ہیں آپ نیر انکا ج اور وہ بھی ابھی اسی وقت۔“ اس کے سر پہ تو کیا دھما کیا گیا تھا، جو ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ گھر آتے ہی مانے یہ مڑ دینا تو محض کا احساس جانے کہاں جا چھپا۔ حیرت کی جگہ اب غم وغصے نے لے لی۔

”آپ نے مجھ سے پوچھا تو دور کی بات بتانا تک کو رائنڈ کیا۔“

”بیٹا بتاتا رہے۔“ ماہاتریس جے آکر بولیں انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا زندگی میں کبھی اس درجہ بھی بے بسی کا مقام آئے گا کہ اپنی اولاد کے سامنے ہی مجرموں کی طرح سر جھکا پڑے گا۔ داور ملک کی دھکیوں کے باعث انہیں مجبور ہو کر اگر ایمن کو انہوں نے دانستہ نہیں بتایا۔ وہ بھی ان کی طرح تھی تو بے بس۔ قیل از وقت آگئی کے عذاب سے بچانے کی خاطر انہوں نے اسے بے خبر رکھنا مناسب خیال کیا تھا۔ مگر ایمن کا رویہ اب انہیں پریشان کرنے لگا تھا۔ اس نے آسان سر پہ اٹھایا تھا۔

”آپ نے سوچا بھی کیسے اما کہ میں پاپا کے ہاتھوں میں کھینچ لی بن جاؤں گی۔ دیکھو مجھے آپ بھی ہے۔ اگر آپ پہلے بتا دیتیں تو..... میں یہ شادی بالکل نہیں کروں گی۔ بتا دیں پاپا کو کیا کر سکیں گے وہ میرے میں بالغ ہوں اپنا فیصلہ کر سکتی ہوں۔“

”ایما! ایمن بیٹا۔ سلطان شاہ آپ کے قاضی صاحب تیار ہیں تم ثابت ہو گئی ہو۔ میں بے حد پریشان تھی تمہارے پاپا۔“

”یہ دوسرا امت ڈرائس مجھے پاپا سے یہ ان کی بھول ہے میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ وہ سختی سے بولی تو اما غافل سی ہو گئیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انہوں نے ہم کر اس کے پیچھے سے ہوئے روپ کو دیکھ لیا تھا۔

”مطلب میں یہ شادی نہیں کر رہی۔“ اس نے بے خوف لہجے میں کہہ کر تپائی کو دور سے ٹھوکر سی دی تھی۔

دو تھوڑے ہی دنوں میں اس وقت جا کر وہاں کے علاوہ قاضی صاحب اور داور ملک بھی موجود تھے۔ بلا تکلیف صوفے پر سلطان شاہ تجھے زانو بے بہت شاہانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک باز صوفے پہ بچھلا رکھا تھا۔ خادم حسین اس کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے موزا نے انداز میں لارٹ کھڑا تھا۔ داور ملک صوفے پہ پہلو بدلتے ہوئے فطری انداز میں دست و پاؤں پہ کھڑا کر کے عمیق سوچ میں غرق ہو جاتے۔ ان کی ایک ایک جنبش سے فطرب و بے قراری کا عنصر چمک رہا تھا۔ کبھی دروازہ کھول کر ملازمہ اندر آتی تھیں۔

”صاحب ابی بنی کہہ رہی ہیں میں یہ جو رائنڈ نہیں ہوں گی۔“ بازو دیکھا پیرائیزل ڈریس آگے کرتے ہوئے ملازمہ نے منہنا کر کہا۔

”کیا بدتمیزی ہے۔“ داور ملک کا موزہ بری طرح سے جڑا تھا ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھتے ہوئے انہوں نے معذرت خور ہانڈ جھگڑا میں پڑا لی۔

”میں معذرت چاہتا ہوں سلطان شاہ! میں ابھی آتا ہوں۔“ سلطان شاہ کی سولہ نگاہوں کے جواب میں محض اتنا سا جملہ اس کی تشفی کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ معاملے کی گھمبیرت کے پیش نظر ایک ہل میں مسئلہ کی نوعیت جان کر انہیں ٹوک گیا۔

”وہ اسے منٹ۔ داور ملک آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔“ وہ ان کے قریب آگیا۔ داور ملک کچھ کہنا چاہتے تھے مگر سلطان شاہ کے سر دنا ٹرکود کچھ کرارادہ ہوتی کر دیا۔ سلطان شاہ ملازمہ کو اشارہ کرنا ہو اور وارو سے نکل گیا۔ ملازمہ کی راہنمائی میں وہ ایمن کے پیڑروم تک رسائی پاسکا تھا۔

”لما! صرف آپ کی خاطر میں نے یہ قربانی دی ہے۔ اب اور کیا چاہتی ہیں۔“ بن تو گئی ہوں قربانی کا کھرا۔“ سلطان شاہ نے رک کر ان کی بات چیت پہ دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دھڑلے سے دروازہ کھلتے ہی اما کے ساتھ ساتھ ایمن نے بھی میکانی انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ مقابلے لہجے چوڑے ہو کر دیکھ کر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

سلطان شاہ کے اشارے پر ملازمہ کپڑے پیڑ پر ڈال کر وہاں بیٹھ گئی۔ مقدمہ برصا کر قاضی سمیٹے ہوئے سلطان شاہ ایمن کے قریب آکر اسے سدا کی بولڈری ایمن جانے کیوں اس سے گفتگو دیتی ہو گئی۔ شاید اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ یا پھر سلطان شاہ کی تروں کر دینے والی نگاہوں کا اثر تھا کہ وہ ان جاوواڑ آنکھوں میں زیادہ دیر کھانڈ جھپائی نظر کا زویہ بدلتے ہوئے ہکا سارخ موزا لیا۔ دراصل وہ اپنی لپٹائی اس پر غائب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سلطان شاہ نے ہاتھ برصا کر ایمن کی کھانڈی اتھنی گرفت میں جکڑتے ہوئے جھٹکے سے رخ پھیر کر اپنی جانب کر لیا۔

”اٹنی جھٹک تمہیں سلطان شاہ کی دلچسپی فضا مناسب لگے گی۔ نہ کہ جو میں باری ہوئی متاع کی حیثیت سے لپٹے آپ کو میرے سامنے پیش کرنا۔“ سلطان شاہ نے پرسکون رہتے ہوئے بھی ایمن ملک کی ہستی کی عمارت لگڑا دیا۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے اس کی ذات کے نیچے کو لہڑ کر رکھ دیا۔

”تمہیں شاید تمہارے والدہ گرامی نے یہ نہیں بتایا کہ نکاح میں ان کی درخواست پر کر رہا ہوں۔ نو پر اہم مت پہنویہ ڈریس۔“ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تو میں نکاح ضروری نہیں سمجھتا۔ جانا تو تمہیں میرے ساتھ ہے ہی۔ ان فارمیٹرز کو نہ بھی بلایا جائے تو.....“ اسے بھندو دیکھا وہ بولہ بہت خوب صورتی سے اس کی نکات پر دوڑا لگا گیا تھا۔

ایمن ملک کے اندر بہت آہستگی سے کچھ ٹوٹا تھا اور ٹوٹا چلا گیا۔ وہ غلط کب کہہ رہا تھا۔ یہی سچ تھا آنکھوں کے فرش نم ہوئے جھٹکے کو کتاب ہوئے۔ جب اس نے پیڑ پر دھرا دوزنا جوڑا اٹھایا تو تیزی سے ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ سلطان شاہ نے ایک کچھ غلط انداز ملا کے پتھر بے وجود پر ڈالی اور دونوں کارن موزا لیا۔ یہ سچ تھا وہ صرف جینے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ یہ خیال اس کی اکثری ہوئی گردن کے کلف میں اضافے کا باعث بنا تھا۔



اس کا روادار دھمکیاں سب دھری رہ گئیں۔ شادی کا دن بھی آئی پہنچا۔ ملاں اور آسیر نے اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر فرج کیا تھا اور بہت شان سے اسے رخصت کیا۔ وہ جو دھمکی دیتی تھی۔ بین نکاح کے وقت انکار کر دیں گی۔ کچھ بھی نہ کر پائی۔ یوں زبردستی اسے مولا احمد کی دلہن بنا دیا گیا۔ اس کی پور پور اس انجمن شخص کے لیے سجائی گئی۔ اسی کے نام کی ہندی ہاتھوں پر ہبک اٹھی تھی۔ ملاں بے حد خوش اور سرشار تھیں۔ آسیہ بھی اس فرض کی ادائیگی پہ خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اسی درخف کی خاطر اس نے اپنے آپ کو مار کر اسٹیلچر اور کارنی کا ذریعہ معاش اختیار کیا تھا۔ آج اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لبا کے سامنے سرخو ہو گئی ہو۔ آج اسے کیا وعدہ تھا کہ خود کھانا کھا محسوس کر رہی تھی۔ درخف پتھر کے بت کی مانند مساکت و مسامت ہر احساس سے عاری محسوس کر رہی تھی۔ اس کی سکھیاں مولا احمد کے نام سے اسے چھیڑ رہی تھیں اور جانے کیا کیا سرکوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ سن پائی۔ آنکھوں کے سامنے تو بکھرتے خواب کا ٹپن کر گزر رہے تھے۔ آنسو کہیں اندر جم کر رہ گئے۔ پھر وہ مولا احمد کے منگ رخصت ہو کر ملاں کی دلہن پارکرنی لیکن دل میں جو طوفان مچل رہے تھے وہ تھیں مولا احمد کی زندگی میں باقی لانے والے تھے۔ اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا ہی پیش خیمہ ثابت ہونا تھی۔



جس وقت گاڑی سیاہ آنکھی گیٹ کے اندر داخل ہوئی رات کی سیاسی پوری طرح پھیلا چکی تھی ایمن ملک فرخت میٹ پر سلطان شاہ کے مقابل بیٹھی خالی لذتہنی سے کوہ میں رکھے ہاتھوں کو تنکے جاری تھی۔ سلطان شاہ نے ایک بار بھی اس کے سچے سنورے سر پہ کو کچھ بھر کے دیکھنے کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ گاڑی رکتے ہی خادم حسین نکلی کی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا پھر لپکتے ہوئے سلطان شاہ کے لیے دروازہ کھول دیا۔ سلطان شاہ اسی رغبت و خوت سے سر اٹھائے گاڑی سے باہر آ گیا۔

”تم جاؤ خادم حسین۔“ خادم حسین کو گاڑی کے گرگھوم کر دوسرا دروازہ کھولتے دیکھ کر سلطان شاہ نے بھاری آواز میں حکم دیا۔ خادم حسین سلام کرتا سرخوت کو اڑ کر جانب چلا گیا۔ سلطان شاہ مقدمہ برصا کر اس کی سمت آگیا۔ ایمن ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔ اسے دیکھ کر بے اختیار کسی موی جسم کا تصور ذہن میں ابھر رہا تھا۔ سلطان شاہ نے ذرا سا جھک کر دروازہ کھولا۔ اگرچہ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے جتنا تاریک اور سناں ماحول میں ارتعاش کی مانند ابھری تھی مگر اس کے مساکت و جود میں کوئی تحریک پیدا نہ ہوتے دیکھ کر سلطان شاہ کی صبح پوچھنا ہی ممکن آوے ہو گئی۔

”آؤ۔“ اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا کر وہوٹھے پن سے بولا تھا۔ ایمن اس کی بھاری آواز سن کر یوں پٹکی جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر جا گئی ہو۔ کچھ دیر غائب دماغی سے سلطان شاہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر سر آدھ بھر کے اپنا نازک سا ہاتھ اپنا ہاتھ اس کے پر خدمت بھاری ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ کیا اس کے ہاتھ میں گیا کہ جب سے سوئے جاگے سے احساسات یکبارگی بیدار ہو گئے۔ پورے جود میں سسکی سے بھر پور بھریں سرایت کرتی چلی گئیں۔ اس انوکھے احساس نے ایمن کو ہل بھر کے لیے بھونچکا کر دیا۔ بھاری لباس سنبھالے ہوئے آہستگی سے باہر آئی تو پہلے ہی قدم پہ پٹنے میں شدید دشواری محسوس کر کے بے ساختہ ہی سلطان شاہ کی سمت دیکھا تھا۔ اسی ہل سلطان شاہ کی نظر بھی اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سمجھتے ہوئے جا کس تر دود کے سلطان شاہ نے نہایت متعجبانہ بھرے انداز میں اپنا بازو اس کی کمر کے گرد جھانک کر دیا۔ ایمن کے پورے

وجود میں جیسے کوئی برقی رودہ لگی۔ سلطان شاہ کے ایک ہی بے حد جھجک محسوس ہوتی تھی۔ جبکہ وہ ہر احساس سے عاری اسے یوں ہی سہارا دیے اندر دینی جسے کی جانب لایا تھا۔ لان اور آمد سے ملتی میز میوں کے آغاز پر فوزیہ نے مسکراتے ہوئے انہیں وٹس کیا اور یوں ہی مسکراتے ہوئے پھول پھل کر دیے۔

”کہیں کھڑی رہیں آگے آتے موت نظر آتی تھی۔“ سلطان شاہ کی اس سرد پھکار پر امین بوجھل پٹکیں اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ سلطان شاہ کا چہرہ غصہ و غضب کی تصویر بنا نظر آیا جبکہ سفید لباس میں وہ نگاہی کی لڑکی خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔ ایک ہی نگاہ میں امین نے فوزیہ کی بیروں ہی دقتی آنکھوں میں لٹی کی اور وحشت کو پایا۔ وہ جاننا چاہتی تھی فوزیہ کے بارے میں۔ ذہن کے کسی کو نے میں اس خیال نے بھی جگہ پائی تھی۔ شاید ملازمہ ہو مگر فوزیہ کے طے نے سختی سے اس بات کی تردید کر دی تھی۔ پھر کون ہے یہ؟ ایک سوائڈ نشان تھا۔ واصل ابھی کچھ دیر قبل سلطان شاہ کے کس نے اسے جس نے احساس سے دوچار کیا تھا اسی کے باعث امین کو اس لڑکی کا زہد ممکن حسن خائف کر گیا تھا مگر یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ جیسی اس نے پکوں کی چٹن کر کے ہوئے ہونٹوں کو سختی سے چھینچ لیا۔



بیڈروم سانگی گرافت سے سجایا گیا تھا اگرچہ اس کے آدھ کے مطابق تو نہیں تھا مگر تازہ ابھی نہیں گھر بھی اس کے گھر کی نسبت بہت برا اور خوب صورت تھا۔ کچھ دیر قبل ہی درخف کی نند نے گھر دکھانے کی آفر دی تھی۔ جسے اس نے نہایت بد چالگی سے رد کر دیا۔

”اوکے پھر آپ بھائی جان کے ساتھ کچھ لیجیے گا۔“ نندا کواری چھپا کر مسکراتے ہوئے بولی پھر اسے وٹس کرتے ہوئے مزید رکے بنا کر سے سے چلی گئی۔ درخف تب سے گردن گھما گھما کر جائزہ لینے میں لگن تھی۔ دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی دل عجیب بے ہنگم سے انداز میں دھڑکا۔ جسے اس نے نہایت سختی سے اس گستاخی پر ڈانٹ دیا۔ نگاہ جھٹک کر ڈرائنگ ٹیبل کے آگے میں چھللاتے ہوئے اپنے دلکش روپ پہ جا پڑی۔ بلاشبہ دن عروقی لباس میں اس وقت وہ ڈاکٹر ایک اپ بوطحائی زیورات سے سجی آسمان سے مزی در دکھائی دے رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ دروازے پر آن کے رک کی جب اس نے اپنے طلسماتی عکس سے نگاہ بنا کر سر جھکا لیا اسے اس وقت بھی یوں لگا۔ جیسے دلہن کے گیت اب میں وہ کسی فلم کی شوٹ پر ہے۔ یہ خیال خوش کن تھا۔ وایتی انداز میں سٹ کر بیٹھے ہوئے اس نے دل کی دھڑکنوں کو شمار کرنا چاہا تو حیرت انگیز طور پر ان کی انوکھی رنگ پر ٹھٹھک سی گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ پھر ٹھٹھک سے بند ہونے کی آواز ابھری۔ یقیناً لاک ڈنگیا گیا تھا۔ درخف خود کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ کسی طرح اسے کھری کھری سا کر اپنا پوائنٹ آف ویو واضح کرنا ہے۔ کمرے کی فضا میں پھلتی پھٹتی سمور کن مردانہ کولن کی بہک کی کی آمد کا دل دھڑکا دینے والا احساس بن کر اس کے اعصاب پر مملہ آور ہوئی تھی پھر کوئی آہٹ سنی سے چلتا ہوا اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ وہ خوشگوار بہک اب براہ راست اس کے دوا بنے پہلو سے اس پر گرفت مضبوط کرنے لگی۔ درخف نے پھر سے دل میں تجدید عہد کیا تھا۔ بھاری خوب صورت مالا جو اس کے آس پاس ٹکھرا اب سلام کیا گیا تھا۔ جس کا جواب دینا اس نے ضروری خیال نہیں کیا۔

”میں نے سنا تھا آپ بہت خوب صورت ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یقین آ رہا ہے۔“ گھمبیر سر کوشا نہ طلسم کھیر تالیف اس کی ہاتھوں پہ فوجوں جھونکے لگا پھر اس کا ہاتھ تمام لیا گیا۔ درخف نا کواری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر جانے کیا ہوا ذہن بالکل تاریک ہو گیا ایک دم سہاٹ اس نے گھر آکر کچھ لوٹنے کی اور ہاتھ کھینچنا چاہا مگر نگاہ تک پہنچ کر ہی ٹھٹھک گئی اس کا چہرہ سا ہاتھ جس ہاتھ میں وہ لپا ہوا تھا۔ وہ کوئی نام ہاتھ نہیں تھا مگر وطنی انگلیوں سے سامنے سفید مضبوط ہاتھ تھا جس کی یہی نگاہی اور جلد بے پناہ شفاف تھی۔ اس قدر شفاف کہ جلد کے نیچے ہر سیڑی کا جال نمایاں تھا۔ چوڑے چوڑے صاف سحرے ناخن ہاتھ کی پشت پر موجو سیاہ روال ہاتھ اتار پھر پورے تو خود کیا ہو گا؟ یہ سوچا بہت سرعت سے دماغ میں گھسی تھی۔ اسے اپنی سہیلوں کے شوق فقر سے یاد آنے لگے جو انہوں نے دلہا کی تعریف میں کہے تھے۔ مگر تب اس نے غم و غصے کی زبانی دنی کے باعث وجہ سے نہ سننے سچے گلاب اندر پیچنے والی اسے دیکھنے کی خواہش خود یہ دہر کی صورت میں اسے بے بس کر گئی۔ ایک جھٹکے سے سروٹوچا کر کے اس نے مرواحہ کو دیکھا اور بیہوش رہ گئی۔ سفید کھٹ دار شلوار سوٹ میں گاؤٹیسے سے ٹپک لگے وہ قدرت کی صنائی کا غمگین شاہکار دکھائی دے رہا تھا۔ ہمانی دیوتاؤں کے سے دلکش نقوش سمیت مردانہ جاتوں کا مکمل نمونہ شخص مسکراتے ہوئے ہلکا سا اس کی سمت جھک کر آیا تھا۔ کیا رنگ پہنار ہاتھ آیا اسے مسرور کر رہا تھا۔ پٹکیں تک بھپکائے بنا وہ یک ٹپک اسے دیکھنے لگی۔ جانے اسے یقین نہیں آیا تھا شاید لال پر یا پھر اپنی قسمت پر کیا وہ اس قدر خوش نصیب تھی کہ اتنا خوش مراد اس کے حصے میں آیا تھا۔ مراد اسے رنگ پہنار کر سیدھا ہوا تو اسے یوں خوبیت سے اپنی سمت دیکھتا پا کر پہلے تو نکا پھر چٹل سا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ایسے کیا دہری ہیں؟“ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے اس نے درخف کی کمریت کو کھیر دیا۔ درخف چونکی تھی۔ پھر دھیسے سروں میں ہنس دی۔ مرواحہ ہار ہنسنے سے ٹپک لگا ہوا اسے مخاطب کر گیا۔

”درخف! اس گھر میں آج سے قبل میں تھا لیکن اب آپ آگئی ہیں تو سب کچھ آپ کے حوالے مجھ سمیت کیا آپ سنبھالیں گی؟“ اس کا ہاتھ پکڑ کر مراد نے اس کی آنکھوں میں چھانکنا وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پتا نہایت سے بولی تھی۔

”ہاں خوشی سنبھالوں گی آپ سمیت۔“ اس نے ٹھٹھکا ہوا انشا اساتجہ کھیرتے ہوئے مراد کے فرار غصے میں منہ چھپایا۔ مرواحہ اسے شانوں سے ہاتھ پکڑا تھا ٹھٹھکا سا گیا۔ آنکھوں میں ملتی جوت یک دم مدہم پڑ گئی۔

”کیا ہو مراد؟“ جب اس کی طرف سے خاصی دیر تک کوئی پیش رفت نہ ہوئی تب درخف نے سر اٹھا کر تیز حیرانگی سے استفسار کیا۔ مراد یوں چونک گیا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔

”اے ہاں کچھ نہیں۔“ وہ گڑ بڑا سا گیا پھر اسے دور بٹاتے ہوئے رسامیت سے بولا تھا۔

”آپ پہنچ کر لیں تھک گئی ہوں گی۔“ ڈرائنگ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اسے دیکھے بنا میگزین اٹھا کر دون کی روانی شروع کر دی۔ درخف کا موزیک دی سی خراب ہوا تھا۔ بی جا ہا آگے بڑھ کر میگزین چھین کر کھڑے کھڑے کر دے پھر اسے بتائے وہ چٹکی نہیں ہے۔ تمہیں تو کیا فائدہ قہر سب کچھ ہی اسے دیکھنے کے بعد کہیں چھپ گئے ہیں۔ مگر مرواحہ کوڈ کے متعلق اسے بالکل آگاہی نہیں تھی جیسا بنا کچھ کچھ اٹھ گئی البتہ یہ میگزین اس وقت سخت زہر لگد ہاتھ کچھ دیر بعد واپس آئی تو آؤٹ ڈیس میں تھی۔ مرواحہ آہٹ پر سروٹوچا کیا۔ ایک بار پھر اس کے صبح چہرے پر ٹٹکیں نمودار ہو گئیں۔ اس ناکی کا نگاہ انتہائی ڈیپ تھا اور رنگ بالکل اچھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی دو شب خوبلی کے لباس تھے۔ مگر درخف نے جانے کیا سوچ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ اب پہنچ کر اس نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور میگزین بند کر کے رکھنے کے بعد اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”آجائیں۔“ درخف نے اپنا ہی نہیں پورے کا پورا وجود خوشی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی پانچ بھول چٹکی تھی۔ اس وقت بادھا تو بس یہی کہ اس کا شوہر بہت جینڈم اور باوقار ہے۔ وہ پوری طرح اس کے حسن کی اسیر ہو چکی تھی۔



جس طرح گھر کی ایک ایک شے سے لارت چٹک رہی تھی اس طرح یہ بیڈروم بھی کیلین کے اعلیٰ ذوق کی نگاہی کر رہا تھا۔ ہر شے بہتر سے بہترین اور بے حد نصیب تھی۔ کارپٹ سے لے کر پروں تک ہر چیز میں میچنگ کا خیال رکھا گیا تھا۔ بلو وارف وائٹ کے کبھی نشن سے سجایا خواب آسا بیڈروم اس قدر آؤٹ لک انداز میں ڈیکورینڈ گیا تھا کہ وہ سب کچھ اوش کے جائزہ لینے میں لگن تھی۔ اگرچہ وہ کبھی سمجھ دھوکہ دیتی تھی مگر اس بیڈروم کی آرائش نے وقتی طور پر سی لیکن اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے اپنے لباس نافرہ پہنا وہ اونی اوپن ہلکا بارچہ ٹپک گئی۔ ورنہ گھما گھرے اور دھپے پڑوسنے کی تاروں کا نقشہ جال بنا ہوا تھا۔ بہت پیسہ سلطان شاہ کے پاس چھپی تو آج میں اس کی بیچ جائے ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند چھل گیا۔ دل اس تذلیل پر لاسرو سکتے لگا۔ کبھی سوچا تھا یوں جوئے میں ہار کر اس قدر بے بس ہو جائے گی۔ آنسو پکوں کی بارگھ بھانگنا ہی چاہتے تھے کہ سلطان شاہ کی آمد نہ انہیں وہیں خشک کر ڈالا۔ سلطان شاہ ازلے بے نیازی سے اسے نظر انداز کیے یوں مصروف تھا جیسے اس وقت کمرے میں امین ملک کا جیتا جاگتا وجود سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ایک ایک لڑا سے بے نیازی جھٹک رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے لاکر کھول کر ایک تھیلی کیس نکال کر امین کے قریب رکھا تھا۔ پھر کپڑے نکال کر وائٹ روٹ میں گھس گیا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے امین مسلسل پانی کے گرنے کی آواز سن رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں کے بعد وہ ایک بار پھر واروہا بیو جینز بیو بیان پہنے وائٹ تولیہ گلے میں لٹکائے وہ اب بھی اسے نظر انداز کیے اسے معمول کے کام گزار رہا تھا۔ امین نے جھٹکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ شرٹ لیکن کر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے رک کر بال بنائے پر فیمو سپرے کیا اس کے بعد فریٹ سے لمبی گردن والی بوتل نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گھونٹ گھونٹ دھچلول اندر راتا تار رہا۔

امین پوری آنکھیں واکیے اسے کچھتی رہی۔ سلطان شاہ کوڈ کر کرتے دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ دکھتا ہوا نصیب برباد ہونے پہ تھا۔ وہ جانے کیا کیا سوچتی اس کا جائزہ لیتی رہی۔ دیکھنے میں تیس سے زائد نگاہیں آتا تھا۔ خوب صورت نقوش سے سجایا مروہ بے نیاز پھر دلکش نور گہری آنکھیں جن پر غمور پٹکیں اس منور چہرے کے تاثر کو مدام معصومیت کا تاثر دینے کی کوشش میں مصروف تھیں اس پہ غضب کی ازرا مات بھلا کس شے کی تھی اس میں مگر پھر بھی وہ ایک برائی تھا۔ سلطان شاہ نے اچانک سر اٹھا اسے یوں پوری تو جسے اپنی سمت متوجہ پا کر زہر خند سے منس ہوا۔ امین کو یوں لگا جیسے اس کا خنجر اڑا لیا ہو یا جیسے اپنے حسن کی آگاہی پھر کر کے ہٹا ہوا۔ امین کو یکبارگی اپنی غیر اخلاقی حرکت پہ تازہ آیا تھا۔ نگاہ کتراتے ہوئے اس نے نہ صرف سرجھکا لیا بلکہ رن بھی پکھیر لیا۔

”کیا بات ہے رؤفانی پسند نہیں آئی جو کھول کر دیکھنا تک کو آرائیں۔“ بیڈر پر بیٹھتے ہوئے کیس کی سمت اشارہ کیا جو ابھی تک ویسے ہی رکھا تھا جہاں وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ امین کی سمت سے جواب نہیں آیا۔ شاید سلطان شاہ کو خیر ورت بھی نہیں تھی۔ جیسی دھیان ہو یہ جادیلوری بکس اٹھا کر اگلوٹھے نور انگلی کے دباؤ سے کھولا تھا۔ وہ اس آ بیٹھا تھا۔ اس کے وجود سے سختی بہک امین کو اپنے حصار میں جکڑ گئی تھی۔ اس کا ناک سرایا ہوئے ہوئے کپکپانے لگا کیس کھل چکا تھا۔ اب شعاعیں کھیرتے بیروں سے مزین بھاری ٹیکس سلطان شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ سلطان شاہ نے اس کی سمت جھک کر وہ ٹیکس امین کی گردن کے گرد لپیٹ دیا۔ اب وہ اسے لاکر رہا تھا۔ سلطان شاہ کا چہرہ اب امین کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھا وہ ٹیکس پہنار ہاتھ امین کی گھبرائی کٹر لائی سی تھا۔ اس کی سمت اٹھ گئی۔ اس وقت وہ پورے کا پورا اس پر چھا گیا تھا۔ اسے اپنے خواب یاد آ کر اندامت سے دوچار کرنے لگے۔ ایسا ہی جی دار خوہر اور اکھڑ ساقی مور پند کر رہی تھی۔ وہ جو عورت پر چھا جانے والا ہو جکڑ لینے والا ہو۔ سب کچھ تھا سلطان شاہ میں مگر اب اسے اپنی ہی سوچ سے شرمندگی تھی۔ سلطان شاہ صرف اس پر چھلایا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے تو امین ملک کی ذات کو سرے سے ہی قلم کر ڈالا تھا۔ جب سے وہ اس کے سامنے تھی ایک لفظ بھی تو نہ کہہ پائی تھی مگر اب اسے احساس ہوا تھا۔ سلطان شاہ جیسے بندے کے سامنے اپنی کہانی بے باک بات تھی اپنی کہانیاں مولنا بعد کے عمر کے تھے۔

تھا۔ درخف کی اکثر باتیں اسے ناکواری کا احساس دلاتی تھیں۔ اسے ٹھکانا دیا کرتیں مگر اس کے باوجود اور احمد اسے چاہنے لگا تھا۔ محبت کرنے لگا تھا۔ اپنی فطرت کے مطابق بے غرض بے ریا محبت۔ درخف ایک خوب صورت ساحرہ تھی۔ حسین جاوگرنی تھی جو اسے اپنے سحر میں جکڑ چکی تھی۔ ایک حسین باغی۔ منتر پڑھ کر اسے اپنا سیر کر رہی تھی۔ اور پھر مٹی وہ خوش تھا۔ بے حد خوش۔

”مرادو! کیا وہ تمہیں کہاں کھو گئے؟“ درخف نے اس کی پیشانی کے بال مٹھوں میں جکڑ کر جھٹکا دیا تب وہ بڑبڑا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم؟“ اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بے خیالی میں اسے دیکھا۔

”بھئی میں کہہ رہی تھی؟“ غی غی سے اس کے لیے کہاں جائیں۔ میں نے پہلی بار تو تم سے کچھ مانگا ہے۔“ وہ اسے ٹھٹک کر فرمائش کرنے لگی۔ مراسف دیا۔

”اور میں انکار نہیں کروں گا؟“ ضرور جائیں گے۔“ اس نے محبت کی ہر درخف کی پیشانی پر شیت کرتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

”مگر کہاں؟“ درخف نے ہن کر پوچھا۔

”جہاں تم کہو۔ لب خوش۔“ مرادو نے اس کے بال کھیرے۔

”اوہ قہقہہ یوڈا کرگٹ۔“ درخف نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔



فوزیہ امین کے ساتھ ہی بوی لاؤنڈ میں بیٹھی تھی۔ اسامہ کاربٹ پر بکھرے کھلونوں میں گن گنت تھی دروازے پہ سلطان شاہ نور اور بوی لاؤنڈ سے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھ کر قریب آگئی۔ بریف کیس اس کے ہاتھ سے لے کر میز پہ رکھا۔ پھر کوٹ اتارنے کو ہاتھ بڑھایا تھی سلطان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”تم سنے دو کر رہی تھیں بہت عرصے سے۔ اچھا بھلا جیسا بھی کر لیا۔ اب اسے کرنے دو۔“ اس کا اشارہ ہونے پر بیٹھی امین کی جانب تھا۔

”اٹھو۔“ اس کے پر غوت لہجے میں حکم پھر کواضع حاضر موجود تھا۔ امین قطعی نہ سمجھ پائی۔ وہ بیٹھی الجھن آمیز نگاہوں سے دونوں کو دیکھتی رہی جبکہ فوزیہ اس کی تاخیر پر سخت متوشل نظر آنے لگی۔

”بنا دلو اسے میں ایک بات کو صرف ایک بار کہنے کا عادی ہوں۔ جو نہیں سمجھتا اس کی کم لکلی پر ترس کھانے کے بجائے صرف سزا دیا کرتا ہوں۔“ وہ کوپا چٹکراتا تھا فوزیہ کی آنکھوں سے واضح خوف و ہراس بھگی چھلکے لگی۔ خائف تو امین بھی ہوئی تھی مگر فوزیہ نے بڑبڑائی۔ موصوف کس بات پر گرج رہا ہے؟

”امین! ان کا کوٹ اتار دو بلیر۔“ فوزیہ اس کے پاس آ کر گھٹکھاتے ہوئے کچھ اس قدر جابجاست سے بولی تھی کہ امین بھی گڑبڑا کر فوراً اٹھ گئی اور تانا چہرہ لیے اکھڑے ہوئے سلطان شاہ کے قریب جا کر کوٹ اتار دیا۔ مجلس اتنی ہی بات پر اتنا تیز کہ دل ہی دل میں فحاشی آئی تھی تو دوسری جانب خود پہ حیرت ہو رہی تھی۔ اس طرح تو وہ کبھی کسی سے فوزیہ نہیں ہوئی تھی۔ اس سلطان شاہ میں ایسا کیا تھا کہ اس کے سامنے آنے پر ہی ہاتھوں پاؤں میں لرزش آتی تھی و جو وہ میں سننا نہایت ہی ہونے لگی تھی۔ دل حلق میں ایک جانا کوٹ تارتے ہوئے بھی اس کے ذہن کے کسی کوٹنے میں یہ خوف پوشیدہ تھا کہیں سلطان شاہ غصے میں اس پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ تبھی تیزی سے دور ہٹتے ہوئے کوٹ کو صونے پر ڈال کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کی فوزیہ نے مزید حراساں کر دیا۔

”نہیں امین! بلیر کو کوٹ کو ہنگ کرو۔“ اور امین جو کہ کوٹ تقریباً صونے پر ڈال ہی چکی تھی پٹن کر دوبارہ جھپٹ کر سینے سے لگایا۔

”پھر پھر کیا کروں؟“ سہمے ہوئے انداز میں اس نے فوزیہ کو مخاطب کیا۔ فوزیہ اگر خود بھی سلطان شاہ کی موجودگی کے باعث حواس نہ چھوڑے ہوئی تو یقیناً اس کی گھبرائی ہوئی صورت پر ضرور ترس کھاتی۔

”اسے ہنگ کرو۔“ فوزیہ نے سلطان شاہ کی سمت چورنگ ڈال کر آہٹگی سے جواب دیا۔

”اوہ اچھا! امین نے سر ہلایا تھا کوٹ لیے تیزی سے چلی گئی اور وہاں کوٹ اس کی چٹائی پر موجود سے ہو گیا۔ امین کا سر بہت بری طرح اس کے شانے سے ٹکرایا تھا۔ آنکھوں تلے اندھیرے چھا گئے۔ ایک لمحے کے لیے کچھ نظر نہیں آیا سلطان شاہ ایک تیز پھری نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ کے باہر گیا تب اس نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔



مرادو درخف کو لے کر پہلے اسلام آباد آیا تھا وہاں ایک دن قیام کے دوران لام بری کے دربار پر حاضری دینے کے بعد وہ لوگ مری کے لیے روانہ ہو گئے۔

”تمہیں پتہ ہے درخف میں نے وہاں کیا دیا مانگا؟“ دوران سفر وہ کھڑکی کے رستے جاہر دیکھتے میں تھکی۔ مرادو نے اس کی سوچوں کے ارتکا کھڑکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تم بتاؤ۔“ درخف اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”مجھے کچھ بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہمارے بہت سارے بچے ہوں۔“ درخف نے اس کو جیو پیچر سے پرائوٹھی چمک دکھی تو منہ بسو لیا۔

”یہ کیا بات کر رہے ہو اور امین اتنی جلدی بچے کے حق میں نہیں ہوں۔ میرا فکر خراب ہو جائے گا۔“ مرادو ٹکا تھا پھر اسے غور دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا میری خواہش کا بھی احترام نہیں کروں گی؟“ درخف کا پی جا تھا باپ سے جواب دے ڈالے مگر مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موضوع تبدیل ڈالا۔

”مرادو! تم تھکی گئی بھی جائیں گے۔ پتہ ہے میں کبھی وہاں نہیں گئی۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔“ مرادو خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس بھر کے آنکھیں موندتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر نکال دیا۔ درخف نے اگرچہ اس کی فحاشی کو محسوس کیا تھا مگر اس وقت وہ کوئی بھی پیش رفت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس موقع پر ڈلے رہنے کے لیے اسی طرح کی بے نیازی رہنا تھی۔ اس کے خدشے کے برعکس مرادو کا سو زیادہ دیر تک خراب نہیں رہا۔ کچھ دیر بعد ہی سب کچھ بھول بھال کر وہ سابقہ انداز میں چپکے لگا تھا۔ اس کے منہ سے فحاشی ہر بات کو مرادو نے پورا کیا۔ خوشی کا ستر ام کیا تھا۔ مری کے علاوہ تھیا لگی بیوی کے علاوہ اسے وہ کاغان اور سوات کی سیر کے لیے بھی لے گیا تھا۔ درخف بے حد خوش تھی۔ مرادو کی محبت کے احساس نے اسے مزید کھرا بخش دیا۔ وہ غنوی بعد جب واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تب بھی مرادو نے اسے ڈھیروں کے حساب سے دل کھل کر شاینگ کروائی تھی،

”مرادو! اُس اُس کریم۔“ درخف اُس کریم بارود کی کھل گئی تھی۔ مرادو سے وہیں ٹھہرا کر خود اُس کریم لینے چلا گیا تب درخف کی نگاہ خود سے کچھ فاصلے پر کھڑے اپنی سمت نکلتے اس ڈنگ سے لڑکے سے جا ملی تھی جو بے حد شوق و شگ ساتھ نظر کے اس تصادم پر اس نے فوراً ایک آنکھ داب کر منہ میں کچھ کہا تھا۔ درخف بجائے ہراسانے کے فحاشی پڑی جس سے اس سمت بھیا حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ اب وہ نہ صرف قریب آکھڑا ہوا بلکہ کچھ ٹنگٹانے بھی لگا تھا درخف اس سے باتوں میں لگ گئی۔ تب ہی مرادو اُس کریم لیے چلا آیا۔ درخف کے پاس کسی انجان لڑکے کو کھڑے دیکھ کر اس کی متحی پیشانی پر ناکواری کے بل پڑے تھے۔ مزید غضب درخف کو اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پختے دیکھ کر ہومر لڑنے اُس کریم مارے طیش کے وہیں پھٹک دی اور پاؤں پیچھے ہوئے اس کے پاس آیا تھا۔

”کیا وہاں ہے یہ؟“ اس کا لہجہ بھیچا ہوا اور مشتعل تھا۔ درخف چونک گئی۔ مرادو کے کڑے تیز غضبناک حد تک جڑ چکے تھے جیسی وہ گھبراہٹ لگی۔

”چلو آؤ۔“ مرادو نے آہٹگی نگاہ اس لڑکے پر ڈال کر غصے سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے ساتھ لے گیا تھا۔



امین وسیع و عریض لان میں گھاس کے بڑے ٹھیلے فرش پہ منظر بانہ لاسر سے لٹھریل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بایست کے گھرے ہوئے رنگ واضح محسوس کیے جا سکتے تھے۔ ایک ایک لڑکے ذہنی غلط فہمیاں نمایاں تھا۔ ملتے ملتے وہلا دور جکڑ گئی تھی اور اب بے مقصد لان کے بچوں بیچ بے سنگ مرمر کے فوارے سے پھونکی پانی کی دھاروں کو دیکھنے لگی۔ کبھی سوئنگ پول کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جھلماؤی ہوئی روشنیوں کو اس کا ذہن بے حد منتشر تھا۔ اس گھر میں آکر اسے حیرت کے اتنے بڑے بڑے جھکے تھے کہ لفظ حیرت بہت چھوٹا اور معمولی لگنے لگا تھا۔ سلطان شاہ کے وسیع و عریض گھر میں چار بیڈروم تھے جن میں سے تین فرسٹ فلور پر تھے اور تینوں ہی زیر استعمال تھے ایک بیڈروم میں فوزیہ اسلام کے ساتھ تھی۔ دوسرا امین کے حصے میں آیا۔ تیسرا اور سب سے وسیع شاندار بیڈروم سلطان شاہ کا تھا۔ وہ شخص اس قدر مغرور تھا کہ خود چل کر ان کے پاس نہیں آتا تھا وہ دونوں میں سے جس کی ضرورت ہوئی اسے بولالیتا۔ جس بیڈروم میں شادی کی رات امین کو لایا گیا تھا وہ سلطان شاہ کی ہی ملکیت تھا۔ شادی کے تیسرے دن اس دور اور بڑے شخص نے امین سے کہا تھا۔

”تم جاؤ اور اسے بھیج دو۔“ پہلے تو وہ سمجھ نہ سکتی تھی۔ خیال تھا اسے کوئی کام ہوگا فوزیہ سے جیسی وہ میان دنیا مگر جب رات کو سونے کی غرض سے وہاں آئی تو دروازہ کھولتے ہی دلیہز پہ ساکت ہو گئی جو منظر اس کی سادگت ہوتی نگاہوں نے دیکھا تھا وہ شاید نہیں دیکھنا چاہے تھا۔ آہٹ پر ہی سلطان شاہ کے ساتھ فوزیہ بھی متوجہ ہوئی تھی۔ اسے یوں دروازے کے دو دیوارت بنے دیکھ کر سلطان شاہ کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔ آنکھوں سے کوپا شرارے نکل کر امین کے جوہر کو بھسم کرنے لگے۔ گلاب ہی وہ چھر جھری ہی لے کر جیسے ہوش کی دنیائیں اونٹنی تھی۔ اس سے پہلے کہ پلٹ کر بھاگ جاتی قدم پیچھنے میں نے جکڑ لیے تھے۔

”کیا کر رہی ہو یہاں؟“ وہ کوپا قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا۔ امین کی پہلی ہونے کشادہ آنکھوں میں عایت درجے کا ہم ٹھہرایا اس میں شک نہیں تھا وہ سلطان شاہ سے خائف رہا کرتی تھی۔

”ناؤڈٹ لاسٹ۔“ وہ غرلا اس قدر شدید اسلمٹ پر امین کا چہرہ دھواں دھواں ہوا تھا۔

”زندہ ہو یا مرگئی ہو۔“ اس کا بازو نولادی گرفت میں جکڑ کر زوردار جھٹک دیتے ہوئے وہ کوپا دہاڑا تھا۔ امین بری طرح لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی پھر ایک پل کی بھی تاخیر کیے بنا منہ پر ہاتھ رکھ دیکھ بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی آئی تھی تمام شبہ ستر پر کر وںش بدلتے ہوئے اس کا دماغ سنگٹا رہا تھا۔ ایک ہی منظر بار بار دیکھوں میں روشن ہو کر بے تدری وحشت میں اضافے کا سبب بنارہا یہ سوچیں ہی تھیں کہ سردرد سے پھٹنے لگا تھا۔ فارگیت اس نے کر وںش بدلتے ہوئے سوچا مگر ذہنی پیمان کی طور پر کم نہ ہوا تب شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ایسا کیوں ہو رہا ہے فوزیہ بھی اس کی بیوی ہے۔“ اس نے جیسے خود کو پر سکون کرنا چاہا۔ ”فوزیہ نے میری جگہ نہیں لی بلکہ میں نے اس کا شوہر تقسیم کیا ہے۔ چاہے جیسے بھی حالات تھے۔“ اس کی نگاہ زور رنگ ٹھیل کے آئینے سے دکھائی دینے کے لیے ٹکس پر جا ٹھہری۔ اس وقت وحشت و اضطراب اور بے چینی سے دو بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

”کیا وہاں مجھے یہاں نہیں ہوں۔“ اس نے مختصر ہو کر سوچا اور اپنا چہرہ چھوٹا کیا یہ بڑا ہا ہے۔ رقابت کا زور اور احساس حسد کی کٹی تمہت وائے اس نے ازخود اچنبھے سے خود سے

سوال کیا تو کیا وہ اس سلطان شاہ جیسے حکم چڑھے بدواں بندے سے۔ لوہ نو۔ اس کا سر بے ساختہ چکا گیا۔ مارے فطراب کہ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ مغرور شخص جو اپنے کو کسی دوسرے کو قاتل و دروغ افشا نہیں جانتا تھا اس سے محبت کر بیٹھی ہے۔ یہ خیال بھی سوبان روح تھا۔ دوسرے کے بھی ایسا نہیں چاہ سکتی تھی۔ وہ ہر رات ایسا ہی فطراب اپنے نصیب میں لکھا نہیں چاہتی تھی مگر نادان تھی نہیں جانتی تھی کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جابا کرتی ہے۔ یہ سچ تھا اسے سلطان شاہ سے محبت ہو گئی تھی اور وہ تھی کہ مسلسل لی کیے جا رہی تھی۔ جی تو یہ فطراب بڑھے جارہا تھا اور اسے خبر تک نہ تھی یہ کس کے کارن ہے۔



ان کی واپسی پر ہی اگلے صبح نے انہیں اپنے ہاں ڈنپر اونٹ کر لیا۔ مراد آفس جاتے ہوئے اسے بتا کر گیا تھا کہ اس کی واپسی تک تیاری کر رکھے مراد شام میں گھر آیا تو درجنف بھڑکیے لباس میں بیٹانی سے اس کی خضر تھی۔ ڈارک میک اپ اور جدید تراش فراش کے لباس نے بلاشبہ اس کے حسن کو دوا آٹھ کر دیا تھا مراد کو جس بات پہ اعتراض ہو تھا وہ اس کی سلیبس شرٹ تھی۔ مگر کچھ کہے جناب سمجھ کر رہ گیا۔ گھر کی خراب حالت چیخ چیخ کر درجنف کے پھوڑ پین کا اظہار کر رہی تھی۔ مراد نے یہ سب کچھ بھی دیکھا تھا مگر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ نجف کام سے جی چلتی تھی۔ شادی کے بعد سے تقریباً دو ہزار سے کھانا لاتا تھا۔

”مراد تم ہا لو میں نے تمہارے کپڑے پر پس کر دیے ہیں۔“ اس کی تھکن بے زاری دیکھ کر سے بے نیاز درجنف کے اعصاب پر گھر سے نکلنے کی جلدی سوار تھی۔ مراد کا پیچھا چاہا تھا اسے بری طرح سے جھڑک دے اسے جھنجھوڑ کر بتلائے کہ غصہ کس بات پر آ رہا ہے۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ کچھ بھی کہہ نہ پاتا۔ شاید محبت کرنے والوں کا لی ہی بے بسی نصیب ٹھہرتی ہوگی۔ اسے بھی تو درجنف سے محبت تھی کیسے اس کا دل توڑتا۔ کس دل سے ڈانٹا درجنف نے جو اس کی شدہ ٹلو کرسوٹ اس کے حوالے کیا تھا اس کی ٹکنیں بھی دور نہ ہوتی تھیں۔ مگر تمام کراواں دم میں جانے کے بجائے وہ خود روڈ روک کی سمت بڑھ گیا۔ مگر بڑھ پر اچھال کر اس نے دوسرا سوٹ نکال کر خود کو دواں دم میں بند کر لیا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا درجنف عام لڑکیوں سے اس قدر اگلی کیوں ہے۔ تیار ہونے میں اسے زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔

”تم ایسے ہی چل رہی ہو؟“ رستہ واچ گاڑی پر باندھتے ہوئے اس نے درجنف کو مخاطب کیا۔

”ہاں کیا اچھی نہیں لگ رہی؟“ وہ اٹھلائی تھی۔

”ہم بائیک پر جائیں گے تم بڑی چادر کوڑھ لو۔ دوپٹہ بہت باریک ہے اور تمہاری شرٹ بھی سلیبس ہے۔“ شاید اس سے زیادہ ضبط کاپار نہیں تھا۔ جی تو وہ مغرور و مریانیت سے اسے سوک گیا جبکہ درجنف کے تپور بگڑنے میں دیر نہیں لگی۔

”بائیک پر جا رہے ہیں۔ دوپٹہ باریک ہے سلیبس شرٹ۔ مراد تم نے قدامت پسند ہو گئے ہو۔ میں نے تصور تک نہیں کیا تھا بجائے میری تحریف کرنے کے تم نے محنتوں کا پنڈا رکھ کر کر بیٹھ جاتے ہو تم جتنے ہو اس بات سے کہ ہر کچھ اچھ پھرتی ہے۔ ہر کوئی مجھے ستائش پھری نظروں سے کیوں دیکھتا ہے۔“ وہ جابلوں کی طرح چیخ چیخ کر جھگڑتے ہوئے بولی۔ مراد حیرت سے اس کا یہ بیاد پ دیکھ رہا تھا۔



سلطان شاہ کا طرز عمل ایمن کو سر امراچی اسلٹ محسوس ہوتی تھی۔ یوں بھی اس کے اندر جو جنگ جھڑکتی تھی اس نے اسے بری طرح سے چڑھ کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک انتہی ہوتی تھی۔ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھی کہ وہ سلطان شاہ کی محبت میں گر کر رہ چکی تھی۔ یہ اس کی محبت کی نفی کی کوشش تھی۔ جی تو اس نے خور سے عہد کر لیا تھا۔ سلطان شاہ سے نہ ڈرنے کا اس کی بات نہ ماننے کا نہیں تھیں بتاؤں گی سر شاہ کہ عورت پاؤں کی جوتی نہیں ہے۔ نہ ہی راستے میں بڑے کار چتر جسے تم قدموں کی ٹھوکروں پر رکھو تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔ وہ بوری غور تھیں جوتہاری بے دام غلام بن گئیں۔ اب کے تمہارا واسطہ ایمن ملک سے پڑا ہے۔ وہ جیسے جیسے سوچ رہی تھی، ذہنی کھلن بڑھ رہی تھی۔ اس نے جانا تھا سلطان شاہ نے کبھی اس کا نام نہیں لیا۔ ہمیشہ ہی تحفہ آمیز انداز میں تو یہ تم کہا کرتا اگر فوزیہ سے اس کے متعلق بات کرتا تو منہ بگاڑ کر اس سے کہہ دیتا اور آج تک اتنی ذلت اس قدر نظر انداز کی کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ جس قدر اہانت آمیز سلوک سلطان شاہ اس سے روا رکھے تھا۔ ذرا سامنا یہ غور کرنے پر یہ حقیقت بھی کل کر سامنے آگئی ایسا کہ یہ صرف اس کے ساتھ ہی نہیں تھا فوزیہ کے لیے بھی انداز مختلف ہر گز نہ تھا۔ وہ بھی تو تم اس تھی۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا یہ جان کر اسے صبر آجاتا مگر ایمن ملک تو مزید بھڑک اٹھی تھی۔ جب ہی اس نے قطعی فیصلہ کر لیا۔ اس پتھر میں چونکہ لگائے گی۔ برف پگھلا اُلے گی۔ وہ خول توڑے گی جو سلطان شاہ خود پر چڑھائے ہوئے ہے۔ اسے تو یہ خول ہی لگے تھے۔ سلطان شاہ کو چونکا لے گی جو سب کو چونکا جاتا ہے۔ اسے حیران کرے گی جو سب کو حیران کرتا ہے۔ اسے دکھو گی جو سب کو دکھاتا ہے۔ جب خود سے ارادہ پختہ کر لیا تو فوزیہ کو بھی اس امم میں شامل کرنا چاہا جو بھی تھا یہ کام آسان ہر گز نہ تھا مگر فوزیہ اس کے عزائم سن کر پہلے ہی ہنسی پھر خود وہ گورا میں جب ایمن کوڑے لے دیکھا تو غصے میں آگئی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو ایمن۔ فوزیہ نہ ڈانٹا تھا۔“

”تم یہ بتاؤ میرا ساتھ دو گئی یا نہیں؟“ ایمن نے دو ٹوک انداز بتایا۔

”دیکھو ایمن! تمہیں خود پہ نہیں ہے کہ تم کس قدر غلط بات کر رہی ہو جو بے حسیا ہے اسے قبول کر لینے میں ہی تمہاری عافیت ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے رقابت محسوس نہیں کی کیا یہ اچھی بات نہیں۔ پھر تم کیوں یہ دوسرے رہی ہو۔“

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔ ہاں یا نہیں۔“ ایمن جوشان بکلی تھی اس سے انچ بھر بھی سرکنے کو تیار نہ تھی۔ فوزیہ کے سمجھانے پر رکھائی سے بولن فوزیہ نے ایک اور کوشش کے طور پر اسے سلطان شاہ کے ڈرو سے دیے اسے بتایا کہ سلطان شاہ غصے کا کتنا تیز ہے۔ مگر وہ ایمن ہی کیا جو کسی بات کی ٹھان لے پھر ارادہ بدلے اسے پس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر فوزیہ نے صاف انکار کر دیا۔

”سوری۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔“ ایمن نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے تھے۔

”آئی ڈیفنڈ کیرا میں وہی کروں گی اور دیکھتا تمہارے شاہ صاحب کو کیسے زچ کرتی ہوں۔“ ایمن کے خطرناک عزائم کو فوزیہ نہ مت حاجت پر اتر آئی۔

”پلیز ایمن! تم ایسا کچھ نہیں کرو گئی۔ دیکھو میری بات مان لو۔“ ایمن یوں ٹٹھی رہی جیسے یہ سب کچھ اس سے نہیں کسی اور سے کہا جا رہا ہو۔ فوزیہ کچھ دیر تک بے بسی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے شکستہ ہوئی تھی۔

”کیوں چاہتی ہو ایسا کیا تمہیں ان سے محبت نہیں ہے؟“ ایمن کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا اس نے خود سے فکھ چڑائے ہوئے فوزیہ کو کھانے والی نظروں سے گھورا۔ فوزیہ دھیان دیے بنا بولے گئی۔

”میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی جانتی ہو کیوں کیونکہ مجھے ان سے بے حد محبت ہے اور وہ ایمنی ہے کہ میں انہیں دکھ نہ دوں۔ لیکن ایمن تمہیں میں منع اس لیے کر رہی ہوں سلطان شاہ کے ساتھ میں کچھلے پانچ سالوں سے ہوں کہیں آج تک ذرا سا بھی نہیں سمجھ پائی۔ وہاں جمل شکست ہیں۔ لہذا اب بھی میرا اخصانہ مشورہ یہی ہے۔ یہ خیال دل نے نکال دو ورنہ اس لکڑاؤ سے جو نقصان تمہارا ہو گا وہ مجھے دکھ کر رہے گا۔“ اپنی بات ختم کر کے فوزیہ آگئی تو ایمن نے ہاتھ پکڑ کر رکھ لیا۔

”تم جانتی ہو ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟“ فوزیہ گہرا سانس کھینچ کر کچھ کا زور بدول لگئی۔

”اکھیں مت چڑھو فوزیہ! یہ سچ ہے ہمارے درمیان جو رشتہ ہے وہاں رقابت اور حسد کی بہت گنجائش نکلتی ہے۔ پھر بھی میرے لیے پریشان ہو۔“ فوزیہ مسکرائی۔

”ہاں اس لیے کہ ہمارے درمیان لڑی سلطان شاہ ہیں۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان سے وابستہ لوگوں سے بوجہ ہیں سے محبت کرنا نہیں پڑتی ان خود ہو جاتی ہے۔“ فوزیہ کی بات پر ایمن چند ثانیوں کو نگہ دہی کر لیا وہ بھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ یہ شخص آخر کیا چیز تھا۔ کیوں ہوری تھی ہر کسی کو اس جیسے بندے سے محبت جانے کیوں اس کا دل روٹھا۔ جانے محبت کی بے بسی پر یا اس جذبے کی بے قدر دی۔

”مجھے یہ بات بہت ہرٹ کرتی ہے کہ اس شخص نے میرے ساتھ ظلم کیوں کیا۔ کہا جا رہا تھا میں نے اس کا۔ مجھے نہیں پتہ تھا وہ میرا ہے۔ ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن اگر پتہ چل بھی جاتا تب میں کیا کر سکتی۔“ ایمن اپنے ہاتھوں کا گھورتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”جانتی ہو فوزیہ! جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو بھی سمجھتی تھی کہ سلطان شاہ کاوشا یہ تم سے لوار کی خوشی نہیں ملی۔ مگر اسلہ کے متعلق جان کر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ وہ جو کھیتا ہے۔“

”پلیز ایمن! انہیں یہ طرز مخاطب پسند نہیں اور جو سنایا تو قیامت آجائے گی۔“ فوزیہ نے یوں گہرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ جیسے سلطان شاہ کچھ آج اس پاس وہ ایمن نظر سے مسکرائی۔

”موصوف جوں پہ لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں پر کیوں زبردستی ڈھنستے ہیں۔ جانتی ہو تم وہ ہمارے نام تک لینا کو را نہیں کرتا۔ یہ تم اس کیا ہے یہ تمہیں نہیں لگتا یہ ہماری تو جین ہے سدا لیل ہے۔“ اس پہیجاں چھانے لگا سیزیک ہو کر چچی تو فوزیہ غور و نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے وہ شخص ذہنی مریض ہے۔ بہت پست ہے اس کی سوچ۔ تم اگر میرا ساتھ نہیں بھی دو گئی تا تو مجھے رتی بے فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سوچ لیا ہے سلطان شاہ کو یہ شک ضرور لگاؤں گی۔“ اس نے سر دھجے میں کہا اور جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی۔



آفس سے واپسی پر مراد کو پرانا دوست مل گیا کالج کے زمانے میں اس کی آزر سے گہری دوستی تھی۔ آرزو کی مراد کو کچھ کر کھل اٹھا۔ بہت چاہت سے گلے ملا اور کہیں بچہ کر چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔

”گھر چلو میں چاہے پلوتا ہوں۔“ مراد نے کہا تو آزر مسکرایا تھا۔ راستے پھر مراد اس سے بہت سی باتیں کرتا رہا۔

”بھابی کسی ہیں؟“ آزر نے اس کے منہ درجنف کا نام سن کر اشتیاق سے پوچھا۔

”لوادوں گاپار۔“ مراد نے ہل جاوہر اصل درجنف کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آزر کو گھر لے کر جانے کی آرزو کر رہی تھی۔ مگر اب یہ سوچ کر پریشان تھا جانے نجف نے گھر بھی صاف کیا یا نہیں الٹیر مراد نے سمجھ داری کی کہ راستے میں ہڈی سے کھانا بیک کر دیا۔ چائے تو نجف نہ بھی بنائی تو وہ خود بنا سکتا تھا۔

”کیا بات ہے یا رہنمائی گھر پر نہیں؟“ آؤز نے اس کی اس حرکت کو اچھے سے دیکھا تھا۔

”نہیں یا روبرو اصل درخف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔“ درخف کی طبیعت کے متعلق جو اس نے جھوٹ بولا تھا یہ مصلحت کا تقاضا تھا کہ کچھ بھی تو کہنے والا نہ تھا۔ مرنے کی زندگی بہت صاف تھری اور ہواؤں کی قہقہہ جس میں اس طرح کی گفتگو نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس وقت بھی محلہ بیانی سے کام لینے کے باعث دل پہ بوجھ سا آ رہا تھا۔ جس وقت اس نے دروازے کے پاس بایک روک کر دھتک کے لیے ہاتھ بڑھا تو اس کے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے ہی دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ مراد کی پریشانی نظری قہقہہ بایک وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے اندر چلا آیا۔

”درخف درخف۔“ اس نے آہستگی سے پکارا مگر جواب نہ ملا تھا وہ آگے بڑھا آیا۔ بیڈروم سے تیز تر بولنے کی آواز بابر تک آ رہی تھی۔ اس کے قدم میکا کی انداز میں اسی سمت بڑھنے لگے۔

”ہاں مجھے اعتراض ہے نہ اتنی ہوں کہ میری پہلی محبت ہو مگر اب میں مجبور ہوں تم سمجھو۔“ میں شادی شدہ ہوں تو تم سے اس بل بھی نہیں سکتی۔ وہ جیسا بھی ہے میرا شوہر ہے اگرچہ اس نے میری زندگی کچھ پر شک کر رکھی ہے۔ مرنے کا پتہ ہے۔ شکی مزاج غلطی ہے مگر کیا کروں سمجھا تو ہے۔“ مراد کا پورا بوجھ دناؤں کی زد پر آ گیا چہرے کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ گئی۔ آؤز جو اس کے ساتھ ہی وہاں تک پہنچا تھا ہوا سے ساکڑ مڑاؤ گھور رہا تھا۔ مراد کی سادگی ہوں نے آؤز کے ہونٹوں پر لذت آئی نظریہ مسکراہٹ کو محسوس کیا تو جیسے ہوش کی دنیا میں اوبھ آیا۔ شدید اشتعال کی لہر اس کے اندر سے اٹھی تھی قدم بڑھاتے ہوئے وہ ایک دم ہی دروازہ کھل کر اندر گھس آیا۔ ڈرینک ٹینک کے آئینے کے سامنے کھڑی درخف ایک لنگ کاشوق پورا کر رہی تھی اور اس قدر گن گنی کہ مراد کے آنے کی بھی خبر نہ ہو پائی جبکہ مراد جو غصیل و غضب کی حالت میں اندر آیا تھا۔ اب ششدر سا اس کا یہ بیاروپہ ملاحظہ کر رہا تھا۔ سچی اچانک درخف بولتے ہوئے مڑی اور مراد کو اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک گئی۔

”اوہ مراد اہم کب آئے ہو؟“ چند منٹوں کو خفیف سی کھسیاہٹ میں مبتلا ہو کر وہ اگلے ہی لمحے باطل نظر آنے لگی۔ مراد تو اس کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی اس انسانی خوبی پہ چکر لایا ہوا تھا بھلا کیا جواب دیتا۔

”مراد کیا ہو اور یہ کون ہیں؟“ درخف نے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھنچھنوا رہا تھا پھر آؤز کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی تب مراد کو اس کی سچی کمر جھٹکنے لگا۔

”یہ آؤز ہے میرا دوست آؤز دروازہ تک دم میں چلے ہیں۔“ مرنے کی آنکھیں پھاڑے کھڑے آؤز کا ہاتھ تھام کر کہا اور ہر نکل گیا۔



”تم اپنے گھر چلی جا، مگر اسامہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ خادم حسین تمہیں ڈراپ کر دے گا۔“ صبح آفس جانے سے قبل سلطان شاہ نے امین کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نوزید کو مخاطب کر کے روکے پچھلے انداز میں حکم دیا تھا۔ ”یہ رڈ رائیمن نے بھی سنا تھا تب سے اس کی جان پر ہن آئی تھی۔ تنگی و نوزید کے سر پر سوار ہو گئی۔

”منصوبت جاؤ۔“ اس نے کیا منت کی تھی نوزید نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دائمی حالت پر شبہ ہو۔

”مجھے تمہارے اس خطرے سے ڈر لگتا ہے۔“ دل کا چور زبان پڑا گیا مرنے والی غلطی کا احساس ہو گیا تھا سچی بات بدل گئی۔

”سلطان شاہ نے ایسا کیوں کہا ہے؟“

”پتہ نہیں وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔“ نوزید بیگانگی میں صرف تھی۔ سرسری سا اسے دیکھ کر جواب دیا۔

”کیا سلطان شاہ نے تمہیں اس سے پہلے بھی اس طرح بھیجا ہے؟“

”نہیں۔“ نوزید اب سوٹ کیس بند کر رہی تھی۔ مختصر جواب دیا۔

”تم کیسے رہو گی اور کب تک رہو گی؟“ نوزید نے سر اونچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”آئی مین اسامہ بہت چھوٹا ہے کیسے تم رہو گی؟“

نوزید نے شانے اچکا دیے۔ امین جتنا سوچتی سمجھتی جا رہی تھی، اسے بول بھی آتے دیکھیں کی نوزید آئے پتے کی مانند لڑنے لگا تھا۔ رات ہی تو سلطان شاہ کا پیغام لے کر نوزید اس کے پاس آئی تھی۔

”تمہیں پتا رہے ہیں۔“ اور امین کے کیا سر پہ لگی تھیں وہاں معاملہ ہو گیا۔ بغیر کسی لحاظ کے نہایت درشتی سے انکار کر دیا۔

”میں خود چل کر اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی آج ایک ماہ بعد انیس میری یاد آتی گئی ہے تو خود آ جاؤں۔“ وہ پھر بڑبڑا رہی تھی۔ شادی کے اولین دنوں کے بعد یہ پہلا بار ہوا تھا۔ کچھ نظر انداز کیا غصہ تھا کچھ اپنی تبدیلی کا احساس مانتے تھا۔ سچی غصے میں کہہ دیا نوزید کے سمجھانے کے باوجود وہ ہنسنے لگی تھی مگر نوزید کو سلطان شاہ اس کا انکار پہنچا پڑا۔ اگلے ہی چند لمحوں بعد وہ دنا دنا ہوا اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ امین اس وقت شب خوابی کا لباس پہن کر ڈرینک روم سے باہر آئی تھی۔ اسے یوں غیر متوقع طور پر سامنے پا کر خوفزدہ ہی ہو گئی۔ وہ غرا ہوا اس پر چھپنا تھا۔

امین تو اس کے عام سے کسی حد تک نال روپ سے بھی خائف رہا کرتی تھی۔ اس طرح غضبناک ہوتے دیکھ کر دم عشق میں اٹک گیا۔

”آج تک کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ مجھے۔ یعنی سلطان شاہ کو کسی بات سے انکار کرے۔ تم نے تم ہو کیا؟“ اس کا منہ ہاتھ میں دیوچ کر بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے سر پور اٹھایا۔ امین جو چند لمحوں قبل مارے خوف کے دروں چرواہہ کرتی ہوئی محسوس کر رہی تھی یک دم ہی ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی۔ جیسے لندرن کی چیخ چیخ کر کے جا رہا تھا اب موقع ہے منوالے اپنا آپ اندر کی وہ ضدی لاپروست اور خود مر امین انکڑا لے کر جاگ اٹھی۔

”جب عزت نفس پر مسلسل چوٹ پڑے چند ایسی حفاظت یوں ہی کی جاتی ہے۔“ سلطان شاہ غصے میں آئے سے باہر ہوا جا رہا تھا امین ایک دم ہی بھڑک کر گئی پوری قوت صرف کرتے ہوئے جھپٹے سے اپنا آپ اس کی گرفت سے آزاد کر دیا جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے در آئی تھی۔ یہ سلطان شاہ کو اس سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔

”مانند پور لیگنوج مسٹر شاہ اہم بھی تمہارے بات کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو تم میں سے ڈر گئی ہوں۔ خریدہ انہیں ہے تم نے مجھے ہاں اللہ دھوکے سے حاصل ضرور کر لیا تو اس کا یہ مطلب.....“ سلطان شاہ اس کے یوں اپنے ہاتھ جھٹک دینے کے شک سے ہی نہیں اٹھا تھا۔ اس کے منہ سے برستے انگڑوں پر بالکل ہی حواس گھبرا اٹھے ہی لمحے اس کا وزنی ہاتھ نضا میں کھم کر امین کے چہرے پر جا پڑا، امین الٹ کر بیڑ پر جا گری تھی جبکہ سلطان شاہ کو گیسر تا پاسلگ رہا تھا۔ اس پر جھٹکتے ہوئے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچ کر مقابل کھڑا کرتے ہی پے در پے مزید کتنے ہی تھپڑ اس پر سادیے مگر غصہ پھڑکی کی طور کم نہیں ہوا تھا۔ امین اس کی درندگی کا فائدہ ہو کر مری طرح سکتی رہی۔

”ہاں اب بتاؤ کیا کہنا ہے مجھے تم یا آپ۔“ اسے پاؤں کی زوردار ٹھوکر لگا کر جا رہا نہ انداز میں گھٹیت کر دھکے دیتے ہوئے وہ اس وحشت سے چلا ہوا تھا کہ امین کو اپنے کانوں کے پردے پھٹنے ہوئے محسوس ہوئے اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ ہونٹوں کے کنارے سے خون نکل کر گردن تک پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں کی نمی بھی چہرے کو بھگو گئی تھی۔

”بولو کیا بوجھ ہے تم سے؟“ وہ پھر سے دھاڑا۔

”آ۔۔۔ آپ۔“ امین نے مزید تشدد سے بچنے کی خواہش میں گھبراہٹ زدہ انداز میں بے بسی سے کہا تب سلطان شاہ نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈال کر چہرے کا رخ مولا یا۔

”صرف پانچ منٹ میں علیہ دست کر کے میرے بیڈروم میں آ جاؤ۔ پانچ منٹ کا مطلب چار تو ہو سکتا ہے چھ نہیں اور آئندہ مجھ سے گستاخی کا تصور بھی مت کرنا ورنہ۔“ درخت کوٹھے میں کہتا وہ آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ امین نے لرزے ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا کچھ دیر نیچکیوں سے روٹی رہی پھر جیسے ہی اس کی وارننگ یاد آتی دل ہول کر رہ گیا۔ رونا بھول کر دوڑتی ہوئی قدموں سے اس کے کمرے تک آئی تھی جس وقت دروازہ کھل کر اندر داخل ہوئی مری طرح ہنپ رہی تھی۔ سانسیں الگ بے ترتیب تھیں۔ سلطان شاہ کے ڈرینک کی استائشے قدم اس کی آہٹ پر چھٹے تھے۔ آکھاری سے گردن موڑ کر دیکھا اسے یوں افمنی و غیر اس کمرے کے بچوں بچہ جو اس دیکھ کر ہونٹوں کی ترش میں عجیب مسکراہٹ در آئی۔

”اتنی جلدی۔ حالانکہ میں نے کہا تھا علیہ ٹھیک کر کے آ جاؤ اور حالت درست کرو اپنی۔ روٹی بس روٹی عورت سے مجھے گھن آتی ہے۔“ عجیب سا سرد دین تھا اس کی آنکھوں میں اور پھر وہ حقارت سے بوجھل۔ امین روہوت کی طرح آگے بڑھی پہلے منہ ہاتھ دھو یا بال سنوارے پھر ڈرینک گاؤں کی ڈھیریاں کئے لگی۔ جس وقت سلطان شاہ ڈرینک روم سے باہر آیا امین سر جھکائے صوفے پر بیٹھی اس کی خاطر تھی۔ سلطان شاہ نے عادت کے مطابق پہلے بال ہٹائے پھر پرفیوم پہرے کیا۔ اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی ڈری نہیں امین پہنکھ ڈالنا کو لار نہ کیا تھا۔



”تو یہ وجہ ہے تمہاری مصروفیت کی؟“ مراد نے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنا سب سابق درخف اس کی بات کی گہرائی کو سمجھتا ہوا بنجید کی غور کیے بنا ہی ہے تماشہ نہیں پڑی۔

”ہاں مراد! اصل ایک لنگ میرا شوق نہیں جنون ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس نے کب میری نئی گھر میں نے بھی سوچ لیا ہے اپنا یہ خوب ضرور پورا کر دیں گی۔“ مراد کی ناگواری محسوس کیے بنا وہ شروں ہو چکی تھی۔

”تو نہ کی ہوئی شادی ضروری تو نہ تھا۔“ اندر کا غیرت مندرانا پرست مرد چوٹ کھا کر بلبلاتا تھا۔

”کہاں کرتی تھی مگر ماں تو بس۔“ درخف نے جھکا کر کہا پھر اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”میں نے تو سوچ لیا تھا اس آدھی کمزور پیکھاؤں کی مگر مرام تم مجھے پسند آگے تم بہت چند مورا مرامت ہو۔ میری سہیلیاں میری قسمت پر رشک کرتی ہیں وہ کہتی ہیں مراد جیسا ڈھنگ جو رچا رنگ بندہ ڈھانڈھن مری میں بھی نہیں ہے۔ جانتے ہو مراد میں ظلم انڈسٹری کے سب سے خوب صورت ہیرو کے ساتھ فلمیں کرنے کے خوب دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ تم فلمی دنیا کے تمام ہیروؤں سے زیادہ لکڑ لنگ ہو۔“ درخف اس کی تحریروں کے پل باندھ رہی تھی۔ اور وہ خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پسپوں کا ناخوش چھنا کے سے ٹوٹ کر نکلا تھا۔ یہ وہ نہیں تھی جس کے متعلق مراد احمد جیسا صاف تھرے خیالات کا مالک شخص بہت فرمت سے سوچا کرتا تھا۔ جو کام اس کے تھوہ کتنی ہولت سے کر لایا کرتی۔ مراد احمد نے اس کے حسن کی قدر چند جملے کہے ہوں گے اور وہ پورا یوں سناری تھی۔ اب وہ اسے فلموں میں کام کرنے پر اسکا رہی تھی۔ مرنے ہوئے لاؤ کر رہی تھی۔ اس کی بے تکلفی کا مظاہرہ ہر لوکے اعصاب پر بوجھ بن کر رہا تھا۔ اندر لڑنے کی چھان کو یہ حار رہا تھا۔

”تمہیں احساس تک نہیں ہے تم کیا چیز ہو باقی دڑ کے تمام ہر لٹاؤ تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں۔ بہت اڑا کثیر قسم کی شخصیت ہے تمہاری۔“
مرغضنی سانس بھرتے ہوئے کھڑکھڑایا تھا۔

”بلوہر لواتم بولنے کیوں نہیں۔“ درنجف نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں کیا بے جا ضد کر رہی ہو؟“ مرغوض ج ساہوکر اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت غصہ آگیا۔

”کسی بیوی ہو تم پر بات کا مشورہ دے رہی ہو شیم فارپو۔“ اس نے قہری سے کہتے ہوئے ہاتھ چمڑا لیا۔ دراصل درنجف کے خیالات جان کر اسے بے حد رنج ہوا تھا۔ غصہ انگ تھا وہ اسے کیا سمجھا تھا نکلی کیا تھی۔

”کم آن مراد کسی دنیا نوی بات کر رہے ہو۔ اس میں منہ لانے کی کیا بات ہے یہ تو بہت عام سی بات ہے۔ فلموں میں سب ہیرو فوجا چاہتے ہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ درنجف! دنیاؤ میں فلمی ہیرو ہوں اور نہ ہی ہماری زندگی کسی فلم کی اسٹوری ہے۔ جو ایسی چپ حرکتیں کرتا پھروں۔ تم نکل آؤ اس خیالی زندگی سے۔ اب تم سنگھل نہیں ہو۔ کسی لور کی بھی زندگی تم سے وابستہ ہو چکی ہے۔“ مراد بہت کم غصے میں آتا تھا مگر اس وقت مچر لوز کر بیٹھا۔ درنجف کی باتیں اس کی برداشت کا امتحان ہی تو ہوا کرتی تھیں۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔

”تمہیں یہ چپ حرکتیں گنتی ہیں اور وہ جو تم کرتے ہو ملائی بن کر ہر وقت لہکتی کرتے ہو۔ نماز خود پڑھتی ہے پڑھو مجھے کیوں دعوٰی کرتے ہو اور وہ جو قہری مون پر لے گئے تھے تم کسی فلمی لور کو اپنا پتلا پہنچا رہے تھے تو کسی کو سزا پار کرتے رہے۔ ساری دنیا کا درد تمہارے ہی دل میں آ گیا ہے۔ مزہ خراب کر کے رکھ دیا تم نے تو میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔“ درنجف اس سے زیادہ پلندہ آواز میں چیخنے لگی جانے کب کی بھری فلمی تھی۔ مراد بھونچا کاسا سے دیکھتا رہ گیا وہ مذہب سے دور تھی۔ گیسٹس پسند کرتی تھی۔ فلمی لٹاؤ کو آمیزیل رکھتی تھی مگر اس قدر بے راہ و ہوگی یہ مراد کے تصور تک نہیں تھا۔ اسے بہت دھچکا لگا تھا۔ بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی دل نے۔ وہ لوز بھی جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ مراد کے پاس جیسے الفاظ نہیں رہے تھے۔ سوہنا کچھ بھی کہے پلٹ کر باہر نکل گیا۔



”خادم حسین! جتنے بھی ملازم ہیں سب کو فارغ کرو۔“ سلطان شاہ آف وہایت پینٹ کوٹ میں چلا ہوا خادم حسین سے مخاطب ہوا تھا۔

”جی سرکار۔“ خادم حسین نے بیٹھ کيس اٹھائے پیچھے چلے ہوئے مؤدبانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔

”آج شام میں آؤں تو تمہارے سوا گھر میں کوئی ملازم نظر نہیں آنا چاہیے۔ اور سناوے کہنا کہ گھر کا ہر کام خود کرے گی۔ کھانا تیار ہونا چاہیے۔ ڈشنگ فرسٹ کلاس ہو اس کے علاوہ اسماء کو بھی وہی سنبھالے۔“

ڈرائیور اسے دیکھتے ہوئے المٹ ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر کے اسے پیشہ دیا۔ سلطان شاہ کے اشارے پر ہی شوگر نے ڈرائیو تک سیٹ سنبھالی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔



مراد کا موڈ زیادہ دیر تک آف نہ رہ سکا اس کی سب سے بڑی وجہ درنجف سے دیوانگی کی حدوں کو چھوٹی ہوئی محبت تھی۔ درنجف کی ایک کوشش نے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے وہی کول کھلا دیے۔ اس روز مراد نے درنجف کی خواہش پر اس سے چھٹی کر لی۔ سارا دن خوب مزے لائے گئے۔ پہلے شاپنگ پھری سائیڈ جانے کا پروگرام بنا۔ وہاں سے واپسی پر وہ لوگ رات کا کھانا کھا کر ہی گھر آئے تھے۔

”درنجف! ایک بات کہوں؟“ مراد نے اس کے پیچھے چہرے پر نگاہ جما کر کوہ متعبد باندھی۔

”پلیز اب جانے کی فرمائش نہ کر دینا مراد! جی بہت تھک گئی ہوں۔“ درنجف نے دوپٹہ کھینچ کر اتارتے ہوئے دھڑکے کہنے پر بے زاری سے کہا مراد کچھ خاموش سا ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی پل سنبھل کر بولا۔

”نہیں مجھے اس وقت جانے کی طلب نہیں ہے۔“

”پھر کیا طلب ہے؟“

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ نرم نرم غید روئی کے گالوں سے بچے کو ہنسی مٹی یاری باری بچیاں۔“ درنجف کے منہ کے ذریعے مڑنے لگے اس نے باکوری سے مراد کو روک دیا جو قہقہا اس وقت تصور میں کسی گل کو تھنے سے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ درنجف کی کٹاکاسک ہو کر اس پر پھری گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب روشنی چھوٹ رہی تھی۔ آنکھوں میں بہت خوب صورت ہنر چھلک کر تے ہوئے اس کی خوب صورتی میں مزید انسانے کا سبب بن رہا تھا اور درنجف تو تھی ہی حسن کی شہدائی۔

”بھلا ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہوا گیا؟“ مراد ایک دم چونکتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگا۔

”معلوم نہیں۔“ درنجف نے روکھائی سے جواب دیا۔

”پتہ ہے درنجف! میرے اندر محبت کو پا نے کی خواہش ہسکتی رہی ہے۔ سب اسی حالات کی تمام نظر مینی سے من کی محبتیں مجھ سے چھن گئیں میں نے بہت عرصہ کڑی دھوپ میں آبلہ پائ سزا کیا ہے مگر میرے اندر پھر بھی محبتوں کا سمندر موجزن ہے۔ جس کی لہر لہر پر تمہارے لیے نور ہمارے آنے والے بچوں کے لیے بیار لگتا ہے۔“

”لیکن مراد اتنی جلدی کیا ہے؟ بچے پیدا کرنے کو ساری عمر پڑی ہے۔ ابھی تو مجھے ابھی.....“

”کیا کرنا ہے تمہیں اور اچھا ہے نا خوب صورت سی امر و نیت مل جائے گی۔“ مراد اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔

”میرا فکر خراب ہو جائے گا مراد! ابھی تو مجھے اپنے شوق کی تکمیل کرنی ہے۔“ اس نے زور ٹھٹھے پن سے کہا مراد کو پھر ہی نا کواریت کے احساس نے گھیر لیا اب کچھ بھی کہے وہ لب بھیج کر رہ گیا۔



ملازمین رخصت ہو چکے تھے۔ خادم حسین کی زبانی اسے سلطان شاہ کے اکامات مل چکے تھے یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ بھی اس صورت جبکہ آج تک کوئی کام تھا سے کیا بھی نہیں تھا پھر اتنے چھوٹے بچے کو سنبھالنا لیکن اس نے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں کیا وہ جان گئی تھی سلطان شاہ اسے نا کردہ گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ سلطان شاہ کا سابق رویہ تھا فوزیہ کو گئے چند روزوں ہونے کو آئے تھے اسماء اسے رتوں کو بھی دگاے رکھاتے چھوٹے بچے کے ساتھ یہ ظلم تھا مگر وہ اس زیادتی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتی تھی کہ چھوٹی سی لہجہ کی بہت بڑی سزا بھگت رہی تھی۔ سلطان شاہ کو حیران کرنے کے لیے دھڑکے کا جو پکنا نہ سنا خیاں زمین میں پیدا ہوا تھا۔ وہ سلطان شاہ کب کا ہواؤں میں بکھیر چکا تھا۔ ایک بار پھر اس کا خوف امین کے اعصاب کو جکڑ گیا البتہ وہ اس بات سے مطمئن تھی سلطان شاہ کتنا ہی جاہر سنگدل اور تنگ نظر تھا مگر بہترین باپ تھا۔ اسماء سے اسے بے حد محبت تھی۔ کبھی تو امین کو لگتا جیسے دنیا میں سلطان شاہ جیسے خوش فہمی خوش فہمی کی کوئی کمزوری ہے تو وہ صرف اسماء ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں امین کو امید کی ایک کرن نظر آتی تھی۔ سلطان شاہ کی مضبوط قلع میں داخل ہونے کا راستہ اسے بھائی دیا تھا اور وہ ایک ہی پر جوش ہو گئی۔ یہ خیال ہی سہی خیر تھا۔ سلطان شاہ کو کھوجنے سے پانے کا خیال لیکن مشکل یہ تھی اسماء فوزیہ کا بیٹا تھا فوزیہ کو اس کا دیدار دروازے کو کھولنے کا چاہتی بانہیں امین کو ضرر تھی۔ جب لپکا ہی اس کا دل انوکھی خوش فہمی کر بیٹھا۔ سلطان شاہ تک رسائی کے لیے اسے بھی ایک دروازہ چاہیے تھا۔ وہ بھی امانت کے درجے پر فائز ہو کر یہ کارنامہ انجام دے سکتی تھی۔ اس کا دل اس خیال سے ہی دھڑک اٹھا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“



”مراد! تم نے مجھے بتایا نہیں آؤ کہ بڑا بھائی فلم پروڈیوسر ہے۔“ درنجف نے خود مطمئن رہتے ہوئے بھی اسے شاک لگا دیا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ مراد نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا نیکیوں سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی سرور ہی کا عنصر شامل ہو گیا مراد نے محسوس کیا کہ اس سوال پر درنجف پشیمانی تھی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بات بنا بولی۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ تمہیں کس نے بتایا آؤ کہ بڑا بھائی فلمیں پروڈیوس کرتا ہے؟“ مراد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے ہوئے ہنوز اسی سرو لہجے میں پوچھا۔

”وہ اخبار میں پڑھا تھا۔“

”او آئی سی مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا آؤ اس قدر شور و عرف عسی ہے کہ اس کے بھائی کو اس کے کام پر اتار ڈیوڑی کر دیا جاتا ہے۔“ مراد نے طنز پر مسکراہٹ سے کو یا اس کا مضحکہ اڑا دیا۔ درنجف کو لپکا کبھی اپنی فاش فلمی کا احساس ہوا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ اس کی فلم آؤ سے ملتی ہے پھر نام بھی خاص ملتا جلتا ہے۔ تبھی میں نے اندازہ لگایا۔ تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔“ وہ اٹھنے ہی پل چکوں، سکوں رونے لگی مراد بکھلا سا گیا۔

”میں کب شک کر رہا ہوں! بلیر رونا تو بند کرو۔“ مراد مضحکہ کا تو تھا۔ مراد کی ایک بات پر وہ جس طرح گڑبائی تھی اسے کچھ احساس ہوا تھا اور شک تو یوں بھی ہر انسان خاص طور پر مرد کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے مگر جو وہ سمجھا تھا اس پر یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جیسی درنجف کو چپ کراتے ہوئے بولا۔

”جیسا سا دل ہے تمہارا ابھی یہ صرف ایک مذاق تھا۔ حق بھی نہیں سمجھتیں کی گریں۔“ اس کے انسو پودوں پر چھنے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ لہجہ پھر کو جو خیال دل میں جگمگا رہا تھا اس پر شرمسار ہو گیا۔ کتنا غلط سوچا میں نے۔ اسے خود پر مذمت ہونے لگی۔

”آئی ایم ساری درنجف! پلیز۔“ وہ جس قدر شرمندہ نظر آ رہا تھا درنجف بے ساختہ لٹا آنے والی فلمی کو نہ روک پائی۔

”اس کے سینے سے سر نیتے ہوئے وہ جس شان سے بولی اس نے مراد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔

(باقی آجیہ)

پس ایک تین ہر جانی..... ام سریم..... دوسرا اور آخری حصہ

سلطان شاہ کے جانے کے بعد وہ طبیعت کی خرابی کی پروا کیے بنا کام میں جت لگی تھی۔ اسامہ سورہا تھا اور اسے لالچ تھا اس کے جانے سے پہلے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کر لے وہ بھی باپ پر پڑا تھا۔ غصہ مٹ دھری میں روئے پر آتا تو چپ ہوئے کا نام نہ لیتا۔

”بی بی جی! آپ کا خون ہے۔“ خادم حسین نے جین میں آ کر اسے مطلع کیا تھا سر ہلاتے ہوئے چہلہ بند کر کے وہ اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اچانک ہی سر پھلکا رہا تھا اور ہر منظر جیسے تاریک ہو گیا۔ منھلے منھلے بھی وہ گر گئی تھی۔

”بی بی جی! کیا ہوا؟“ خادم حسین ایک کراس تک آیا تھا جب کہ اندر قدم دھرتا سلطان شاہ وہیں ٹھک سا گیا۔

”دور رہو خادم حسین! میں خود اٹھ جاؤں گی۔“ امین یوں سر جھک رہی تھی جیسے خود پر قابو پانے کی سعی کر رہی ہو۔

”بی بی جی! بی بی! اگر آپ کو ہوا کیا؟“ خادم حسین تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ سلطان شاہ نے اسے از خود اٹھتے دیکھا پھر انہی قدموں سے پلٹ کر چلا گیا۔ بیڑہم سے فائل اٹھائی اور وائس ہو لیا۔ امین ٹیلی فون اسٹینڈ تک آگئی۔ ریسپونڈر اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو ما! السلام علیکم۔“ وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔ ”جی طبیعت ٹھیک نہیں تھی بس یوں ہی پکڑ سا آگیا کم آن مار پشانی کی کیا بات ہے۔ مروں گی نہیں۔“ دھنک ہو گئی۔ ”واٹ؟“ اب کے وہ چونکی تھی۔ چہرہ تھوڑے سا سرخ ہو گیا۔ ”رہی ماما۔“ وہ ایک دم سے چیختی تھی۔ ”میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں اوما کی گاڑی۔“ فون رکھتے ہی اس نے ہاتھ میں چہرہ چھپا لیا۔ اگر ایسا ہو جائے توف وہ جلدی سے اندر بھاگتی تھی۔ اسامہ کو جگا کر ساتھ لیا اور خادم حسین کو گاڑی لانے کا کہہ کر قریبی کلینک آگئی۔

اور وہاں ماما کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا تو گمان تک نہ تھا۔ خدا نے کتنی جلدی اس کی خواہش کو پورا کر دیا تھا۔ پھر اس خوشی میں اس سے کوئی بھی کام ڈھنک سے نہ ہو پایا۔ طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ میڈنگ نے خوشی کو بھگا کر اس پر فحاشت طاری کر دی۔ جس وقت سلطان شاہ وہاں پہنچا حال ہی بستر پر دراز تھی۔ سلطان شاہ چونکے بنا ریف کیس صوفے پر اچھال کر اس تک چلا آیا تھا۔

”تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رہا تو میں یاد دلادوں۔“ لہجے میں تلخی سمونے اے گھورتے ہوئے بولا۔ جب امین خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے کوٹ اتار کر ہینگ کرنے کے بعد جھک کر جوتے اتارنے لگی تھی ایک بار پھر جی لگائے گئے۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر گرتی پڑتی واٹ روم تک گئی تھی۔ حاضمی دیر بعد باہر نکلے تو پہلے سے زیادہ ہال اور درمخس ہوئی۔ سلطان شاہ صوفے پر نیم دراز ناگس ٹھیل پر ٹکائے بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اشارے سے قریب بلا کر پتھر لے اندر میں سوال کیا۔ امین کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اسے بتانے کے خیال سے ہی ہاتھوں پاؤں میں سنسانٹ ہوئے لگی کچھ کہے بنا اس نے جھجک کر سلطان شاہ کو دیکھا تھا گر ان گرم ٹکا ہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹیکس لڑ کر صبح عارضوں پر جھک گئیں۔

”کچھ پوچھا ہے تم سے“ کیا بھری ہو گئی ہو؟“ وہ جھٹکے سے سیدھا ہوتا ہوا تیر لہجے میں غرلا۔

”وہ..... میں..... آپ.....“ امین بری طرح گڑبڑاتی تھی بولکلا مٹ میں منہ سے کچھ غیر واضح سے لفظ پھسلے تھے۔ جھجک اور جیبا نغ تھی وہ بھلا کب اس سے اس قدر بے تکلف تھی کہ یہ بات بتا دیتی۔ سلطان شاہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ امین باقاعدہ لرزے لگی اس کی قربت کسی امتحان سے کم تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“ سلطان شاہ نے اس کا بازو حاکم کر جھٹکے سے رخ اپنی طرف پھیرتے ہوئے ترش روئی سے کہا۔ امین کا چہرہ پھر سے گلابی ہو گیا۔

”وہ..... میں..... اصل.....“ بات مکمل کیے بنا وہ پھر سے ہونٹ کپٹنے لگی۔

”تم مجھے یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تم پر یکے ہو۔“ اف امین کو شاید سلطان شاہ کے یوں ایک دم منہ بھاڑ کر کہہ دینے کی توقع نہیں تھی۔ اسے ڈھیروں شرم نے اپنے دھار میں لیا وہ پہلے ہی کم پزل نہ تھی اب بالکل ہی ہٹس کر گئی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رخ پھیرتے ہوئے باقاعدہ لرزے لگی۔ سلطان شاہ سگنی بھڑکی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر زہر خند لہجے میں بولا تھا تو لہجے میں از خود قہقہہ مٹ آئی۔

”اس قدر ڈر نہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انک انک کر یہ بتانا چاہتی ہو کہ تمہیں بہت شرم آ رہی ہے۔“ اونہ تمہیں اب پتہ چلا ہو گا میں تو بہت دنوں سے آگاہ ہوں۔ تم عورتیں بہت میاں رہتی ہو کبھی معصوم بن کر مر کو لڑتی ہو اور کبھی یک دم ہی۔“ وہ ہونٹ بھیج کر سر جھٹکے لگا۔

”تمہارے لیے یہ دشوار امر کیوں ہوا؟ کیوں دقت نے مجھے آرام سے بتا دیا؟ کیا ثابت کرنا تھا؟“ اب وہ ٹپکتے ہوئے مسلسل اچھڑے جہاں تھا۔

”مائی فٹ جانا میں عورت کو اچھی طرح سے اور اسے اس کی اوقات پر رکھتا ہوں۔ زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ساکت کھڑی سٹشدری امین کو آنکھیں دکھائیں اور مزید کو ہر نشانہ کی کرنے لگا۔

”عورتیں عموماً پریگنسی پریڈ میں اور پریگنسی کے بعد بہت سر پر جڑھ آتی ہیں۔ مجھ سے ایسی توقع مت رکھنا۔ مجھے نفرت ہے ایسی عورتوں سے اور مجھے بیٹا چاہیے صرف بیٹا۔“ اس کا لہجہ پتھر لیا اور کھرت تھا۔ آنکھوں اور چہرے پر عورت کا بھر پور تاثر۔ امین جو تب سے گنگ سی کھڑی اس کی زبان کے جوہر دیکھ رہی تھی بری طرح سے چونک گئی اور پھر جیسے احتجاجاً بولی تھی۔

”بیٹا، مگر میرے اختیار میں کب ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ سلطان شاہ کا بھاری ہاتھ اس کا منہ پھیر گیا۔ امین کے اندر جیسے طوفان ٹپل اٹھے ایک بھری ہوئی شور بد سر پر لندہ سے اٹھی اور اسے غصے کے سمندر میں بہا لے گئی۔ خود کو سنبھال کر وہ اس کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔

”بی بی جی! ہو گئی تمہارے ہاں سلطان شاہ جانتے ہو کیوں؟“ تا کہ تمہارا یہ غرور ٹوٹے۔ شاید تم عورت کی قدر کر لو۔ تم درخت پر اگے تھے تمہیں جنم دینے والی بھی کوئی عورت تھی۔ تم ذہنی مریض ہو لیکن اہل۔“ وہ حلق کے تل چٹکی تو پھر خاموش نہیں ہوئی۔ سلطان شاہ جو اس کی کٹر کٹر جلی زبان سے پکڑا گیا تھا ایک دم غصے سے پھر کر جارحانہ انداز میں اس تک آیا تھا اور نہایت بے دردی سے بالوں سے پکڑ کر گھٹیلتا بیڈ پر لے آیا اس کے بعد جو اس کا ہاتھ اٹھا تو کتنی دیر تک نہیں رکھا۔ امین کو البتہ وہ خاموش کرانے میں ناکام رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ کس نے تمہیں درندگی پر مجبور کیا؟ کس نے جانور بنا دیا۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سلطان شاہ نہایت فخارت سے اسے جھک کر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔



مراد کی اداسیاں اور فسر دگیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ وہ محسوس کر سکتا تھا۔ درنخف اس سے دور ہو چکی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح بے تابا نہ اس کا انتظار نہ کرتی تھی اور نہ ہی اولین دنوں کی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا وہ انداز مراد کے لیے تکلیف دہ تھا مگر یہ رویہ بہت ہی زیادہ اذیت کا باعث تھا۔ درنخف اس کی باتوں کے جواب میں صرف ہوں ہاں کرتی۔ کھینچی کھینچی رہا کرتی۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ ایسی کیوں کر ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ بے حد اپ مٹ تھا۔ متحمل سا اکتایا اکتایا۔ درنخف کی بار بار انگلی سے زندگی سے سب رنگ ہی اڑا دیے تھے وہ اس سے محبت نہیں عشق کرنے لگا تھا۔ نخف کی بے اعتنائی و بے پروائی اسے دکھ دے رہی تھی۔ کو کہ مراد نے اسے مٹانے کی موذی حال کرنے کی کوشش کی ہر طرح سے منایا ڈھیروں شاپنگ کروائی ہو ٹھنک بھی کی مگر نہ سکرانی نہ ہی زندگی پر چھلنا جو دلوتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نخف کو کیا چاہیے۔ اسے تو یہی خبر نہ تھی جب وہ آفس چلا جاتا ہے تو درنخف کیسے وقت گزارتی ہے۔ خوش رہتی ہے کہیں جاتی ہے۔ کون آتا ہے؟



امین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اب وہ گھنٹوں میں منہ چھپائے ہوئے ہلے سسک رہی تھی۔ چہرہ سرخ اور آنکھیں تورم ہو رہی تھیں۔ جلد بھی بے حد کھرا ہوا سا تھا۔ سلطان شاہ وہ دنوں سے گھر نہیں آیا تھا۔ فو زیہ بھی ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ اور اب اسے بچھٹا ہوا رہا تھا۔ آخر میں نے کیوں لڑائی کی ان سے کیوں برا بھلا کہا۔ خوف وحشت بن کر اعصاب پر چھانے لگا تھا۔ اس کا ذہن یک وقت سوچوں کی زور پر تھا کبھی سوچتی سلطان شاہ کیسا کھجور آئی ہے کہ اس خوشخبری نے بھی اسے محور نہیں کیا۔ کبھی ذہن میں آتا کاش میں اسے کچھ نہ کہتی جانے اب کہاں ہوگا۔ چونکہ دل کو اسی محبت کا روگ لگ چکا تھا۔ اب کسی طور پر اڑ نہیں تھا۔ اپنے تئیں تو اتنا کچھ اسے سنا کر اسے زہر اگلنے پر آکھایا تھا۔ مگر اسے وہ وقت نے کی کوشش میں وہ خود ہی کیس گھو گئی تھی۔ اسے آج اس اعتراف میں غار نہیں تھی کہ اسے سلطان شاہ سے محبت تھی محبت کے جواب میں محبت کی خواہش کچھ ایسی بے جا نہیں تھی مگر یہ بات سلطان شاہ کو لولن سمجھاتا۔



جس وقت مراد پھر ہچکا پھیر ونی دروازہ چو پٹ کھلا پڑا تھا۔ کسی انجانہ خدشے نے بچے سے دل میں جگہ پا کر خوف کی صورت دھڑک کو ہڑھٹا ڈالنا تیز قدموں سے اندر آیا تو ایک انہی عورت سے ٹکرا ہوا۔

”آپ کون ہیں خاتون اور درنخف کہاں ہے؟“ وہ تنہیر سا پوچھنے لگا۔ عورت اپنے دھیان میں کچھ نہیں کھڑی ہو رہے پر کچھ بکھاری تھی بری طرح سے چونکی پھر اس پر چڑھ پڑے ہی گھر آگئی۔

”تم درنخف کے شوہر ہو؟“ سوال کے جواب میں سوال ہوا۔ مراد کو سخت کوفت ہوئی متلاشی کا ہوں کو ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے اس نے اثبات میں جواب دے کر پھر سے نخف کے بارے میں پوچھا۔

”نخف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم فوراً اسے ہاسپٹل لے جاؤ۔“

”کیا؟“ اس اچانک آواز نے اس کے حواس قفل کر دیے۔ ”کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ قدموں تے زمین مرنے کی محسوس کر رہا تھا۔

”وقت ضائع مت کرو جلدی کرو۔“ وہ عورت چیختی تھی۔ مراد گھر پر آکر کمرے کی جانب بھاگا جہاں بیڈ پر درنخف بے سدھ پڑی تھی۔

”دری! دری! اینکس کھلو۔“ کیا وہ امیری جان یہ کیا کر لیا تم نے؟“ پہلا خیال اس کے ذہن میں خود کشی کا ہی آیا تھا بد حواسی میں باہر آیا تو اس عورت کو غائب پایا۔ وہ اسی طرح گرتے پڑتے گھر سے نکلا تھا پھر پڑوسی کا گیٹ بجا کر اسے درنخف کی طبیعت کے متعلق بتاتے ہوئے گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔ پڑوسی نجیب صاحب نے اس کا شان چھک کر تھپی دیتے ہوئے نخف کو لانے کا کہا۔ مراد یوں یوں کی طرح دوڑتا ہوا لوٹیں چلا تھا۔ اگلے لمحوں بعد وہ لوگ درنخف کو گاڑی میں ڈالے اسپتال کی سمت جا رہے تھے۔



اسامہ کو مل کر وہ سلطان شاہ کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ ٹی وی بند ہم آواز میں چل رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ گاڑی کے تیز ہارن پر ہڑبوا کر اٹھی۔ اسامہ پر

کچھ ڈالی جو ذرا کسم کسا کر دوبارہ ہو گیا تھا۔ امین اسے تھپکنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی سلطان شاہ بلوچوں میں اندر چلا آیا۔ امین اسے دیکھ کر کچن میں چلی گئی۔ جب تمام ملازمین کی چھٹی ہوئی تھی۔ سلطان شاہ کو کھانا بھی وہی دیتی تھی۔ فریٹ سے دو قسم کے سالن اور بریانی نکال کر لوگوں میں گرم کیا۔ سالاد کی پلٹ ٹرے میں رکھی اور روٹی پکا کر تمام چیزیں سلطنت سے جانے کے بعد اندر چلی آئی۔ سلطان شاہ معمول کی مصروفیت نپٹا کر اسے دیکھ کر پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ امین نے ٹرے پیز پر کچی تب تک وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتا ہوا بلڈ پر دروازہ ہوا اور کبل سرب تک کھینچ لیا۔ امین سن ہی کھڑی رہ گئی۔ تین دن بعد وہ آیا تھا اور تین دن سے نہ تو اس سے بات کر رہا تھا اور نہ ہی کھانا کھاتا۔ امین نے آج دل میں ٹھان رکھی تھی۔ اس سے وجہ ضرور پوچھنے کی مگر اس کے سامنے تمام ہتیس جواب دے جاتیں اس وقت بھی سر جھکا کر بوجھل قدموں سے مڑی تھی۔



مراد بے تابانہ اسپتال کے سر ڈویر میں ٹہل رہا تھا۔ لبوں پر اس کی زندگی کی دعائیں ٹھیل رہی تھیں بھی دروازہ کھول کر ڈاکٹر باہر آئی تھی۔
 ”ہیکسکیزنی ڈاکٹر“ وہ باسرت راستہ روکتے ہوئے درجنف کے متعلق استفسار کرنے لگا۔
 ”شکر کریں مسٹر مراد آپ کی وائف کی جان بچ گئی۔ ورنہ جس قدر اتھانہ حرکت سرزد ہوئی ہے جان جانے کا خطرہ تھا۔“ ڈاکٹر کا خراب موڈ مراد کو چوڑکا گیا۔
 ”مگر ڈاکٹر صاحب! انہیں ہوا کیا تھا مجھے بتائیے پلیز۔“ مراد کے استفسار پہ ڈاکٹر نے باقاعدہ گھور کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
 ”آپ مسٹر مراد احمد ہی ہیں؟“

”جی جی۔“ وہ قلمی سمجھ نہ پایا اس تعارف کی وجہ چھپی حیرت زدہ سا رہا۔
 ”پھر بھی آپ نہیں جانتے میری انٹرنیٹ۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں لہجہ تھا۔
 ”بائے گا ڈاکٹر پلیز میری برداشت کا مزید امتحان مت لیں۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے میری سز کو؟“ وہ مضطرب کھوتے ہوئے حاجت سے بولا تب ڈاکٹر گہرا سانس کھینچ کر بولی تھیں۔

”بہ نہیں آپ کیا کہہ رہیں ہیں آپ کی سپورٹ کے بغیر وہ تنہا لڑا کرتا ہوا اقدم کیسے اٹھا سکتی ہے یہ آپ کا جائزہ نہیں تھا جو یہ سلوک کیا۔ آپ کی وائف کا چار ماہ کا حمل ضائع ہوا ہے۔ لبارش کروایا گیا ہے۔ اور اس قدر رسا کی سے انہیں کسی انجان نے موت کے کنوئیں میں اتارنے کی کوشش کی ہے کہ الامان۔ اپنی وہ یہ نقصان تو عمر بھر ساتھ چلنے والا ہے۔ آپ کو بہت سے کام لینا پڑے گا آپ کی سزا اب کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔“ ڈاکٹر نے مراد احمد کے زرد پڑتے چہرے پر نگاہ ڈال کر تسلی آمیز لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی جبکہ وہ ڈچٹر کے بہت کی مانند سادگت و سامت تھا۔ انجانے میں کتنا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ کیوں کیا نجف تم نے ایسا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ خبر تک نہ ہونے دی۔ سن دو غم سے لبریز دل کے ساتھ وہ مٹھیاں بچھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”کس نے حق دیا تمہیں مجھے اتنی بڑی خوشی سے محروم کرنے کا حق تھا تم نے یہ اسٹیپ لیا اور اتھند بھی۔ اف مائی گاڈ۔“ اس نے بھٹکتی آنکھوں کو میچتے ہوئے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ ”درجنف میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ نوئیور۔“ اس کے اندر نفرت کا سمندر موجزن ہوا تھا۔



فوزیہ کو گئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اب وہ بھی قدرے لیڈ جسٹ ہو چکی تھی۔ زندگی جیسے صبح سے شام تک کام کام اور بس کام کا دو سرانام تھی۔ اسامہ بھی اب قدرے مانوس ہو گیا تھا۔ اسے لان میں پھٹکی دھوپ میں کھلتا چھوڑ کر فیڈ رہنے کی غرض سے اندر آئی تھی۔ وہاں آئی تو بے ساختہ چیخ پڑی۔ اسامہ ٹی میں بری طرح لت پت ہو چکا تھا۔ خادم حسین نے کچھ دیر قبل ہی پوروں کو پانی دیا تھا۔ گیلی گھاس پہ اسامہ اپنے کپڑے خراب کیے اب منہ بسور رہا تھا۔ خادم حسین کوڈانت کر وہ اسامہ کو لیے اندر چلی آئی۔ رونا ہوا اسامہ اب تہاتے ہوئے طوفان برپا کیے ہوئے تھا مگر امین اسے اچھی طرح نہلا کر چھوڑے کا ارادہ باندھ کر تھکی۔
 ”یہ کیا کر رہی ہو گونا گونا عورت، کیوں رلا رہی ہو اسے؟“ اپنی پشت پر سلطان شاہ کی ہماری اور رنگ آواز سن کر امین کے حلق تک کڑواہٹ کھل گئی۔
 ”نہلا رہی ہوں۔“ اس نے بھی جواب پتھر چھوڑا تھا۔ چونہ دیتی تو گستاخ ٹھہرتی۔

”اتنی سردی میں نہلا رہی ہو۔ ان سس فور کاپر نکالو اور کپڑے پہناؤ اسے۔“ وہ قہقہا اسامہ کے رونے کی آواز سن کر ہی سیدھا ہواں آیا تھا۔ امین نے گہرا سانس لیا بھرتے ہوئے اسامہ کو دل میں لپٹا لیا اور باہر آگئی کپڑے پہنا کر اسامہ کو فیڈ دیا۔ سلطان شاہ نے جبک کر روتے ہوئے اسامہ کو پیار کیا تھا پھر غٹکیں کھینچنے سے اسے دیکھتے ہوئے رکھائی سے بولا۔

”آج کے بعد اگر تم نے بچے کو یوں رلا تو ذرا کر دوں گا تمہیں سمجھیں۔“ وہ گویا پھٹکا رہا تھا۔ امین وہیں ہونٹ کھینچے کھڑی رہی۔ جبکہ سلطان شاہ دروازے کو زوردار ٹھوکر کر سید کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔



مراد سخت بدظن ہوا تھا درجنف سے۔ اسے زندگی میں پہلا مرتبہ شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی خود غرضی کے باعث مراد کا ناقابل حلانی نقصان ہوا تھا۔ وہ چار ماہ تھا درجنف نے ایسا کیوں کیا۔ وہاں فنانی نہ چاہتی تھی اپنے تئیں تو اس نے مراد سے چھپنا چاہا تھا۔ دروازہ ہاتھل رہی۔ مراد اس کے پاس گیا نہ بات کی۔ وہ اس کی اولاد کی قائلہ بنی تھی۔ نسل کی تباہی ویر بادی کا باعث ٹھہری تھی۔ اسے معاف کیسے کریتا۔ دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ مگر مضبوط کے ہلے صراط طے کرتا رہا۔ جس شام درجنف کو ڈچٹا راج کیا گیا اسی وقت وہ اسے ساتھ لینے کی غرض سے ہی آیا تھا مگر اس پر پہلی نگاہ ڈال کر ہی بے گامگی اور سردی سب کچھ بھول بھال گیا۔ اسے درجنف کو کچھ کر شہید دھچکا لگا تھا۔ یہ وہ درجنف تو نہ تھی جو شاہ اب تھی جاہلیت جس کی پہچان تھی۔ سو نے ہی کتنی رنگت سروسوں کی مانند زرد تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بے رونق چہرہ اور کچھ ہوئے بال۔ مراد کا دل دھک سے رہ گیا۔ دل نے نظری اٹلی طرفی سمیت تمام خطائیں ہلے بھر میں معاف کر دیں۔

”وری ڈونٹ وری تم ٹھیک ہو جاؤ گی بھول جاؤ سب کچھ۔“ اس کا ہاتھ کام کر چھتے ہوئے محبت کے جام لپٹا لگا۔
 ”لیکن مراد میرا بچہ ابھی نوے دیا میں آتا تھا۔“ وہ ایک دم سے بھٹک کر رو پڑی تو مراد کی آنکھیں بھی جھپکے لگیں۔

”نہیں درجنف میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں مجھے سب سے زیادہ تم عزیز ہو۔ تمہاری خاطر میں بچوں کو بھول جاؤں گا کبھی نام نہیں لوں گا۔ پلیز مت روؤ وہم دونوں بھی بہت خوش رہ سکتے ہیں۔“ اس کی پیشانی پر بسودہ ثبت کرتے ہوئے وہ محبت سے معمور لہجے میں کہتا گیا اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔



سلطان شاہ کمرے کے بچوں سے محظربانہ یہاں سے وہاں ٹہل رہا تھا۔ خوب صورت بادامی آنکھوں میں لکڑے لیتا ہوا وہ منظر اری احساس بے حد نمایاں تھا۔ اس نے پیشانی کو مسلتے ہوئے کچھ سوچا تھا۔ جانے وہ کس سے خائف ہوا تھا خود سے یا امین سے۔ اسے خود سمجھ نہیں آئی۔ تخلیق کے مراحل فوزیہ نے بھی اس کے سامنے طے کیے تھے مگر جانے وہ اتنی دلکش دکھائی نہ دی تھی۔ یا تب سلطان شاہ کی آنکھوں کے رنگ جدا تھے۔ دل میں احساس نہ جا گا تھا۔ سلطان شاہ امین کو دیکھتا تو نگاہ بے قابو ہو جاتی تھا کہ پیرے ٹھٹھاتا تو بھبک جاتی۔ وہ اس کے قرب کا خواہش مند رہنے لگا تھا۔ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تو سرسرا سلطان شاہ کی تو جین تھی۔ وہ خاک کو کیوں کر سر پہ جالیتا۔ یہ تو اس کی شخصیت کی کمزوری تھی اور وہ کمرے کی ایسی کمزوری کی پرغا ہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

جب اور کچھ نہ سوچتا تو خادم حسین کو طلب کر لیا۔ خادم حسین دست بستہ موجود تھا۔
 ”خادم حسین کل تم اسے لے آنا۔“ خادم حسین مالک کے اشارے سمجھتا تھا فوزیہ کو لانے کا حکم ہوا ہے۔

”بم تم جاؤ۔“ خادم حسین موربانہ بھکا اور پلٹ گیا تبھی سلطان شاہ نے پھر یکراں۔ وہ رک کر مالک کو دیکھنے لگا۔
 ”کیسا کرو اسے آج ہی لے آنا بلکہ ابھی جاؤ اور اسے لے آؤ۔“ خادم حسین نے سر ہلایا البتہ قدرے متحیر سا ہو کر اپنے دراز قامت خوب صورت سے مالک کو دیکھا اس کا فیصلہ ایک ہوا کرتا تھا اور وہ بھی اُس کو یا پھر پہلیکیر ثابت ہو کر اٹھ کر چاہے نفع ہو یا نقصان۔ وہ فیصلہ بدلائیں کرتا تھا اور خادم حسین نے دیکھا تھا وقت ثابت کرتا رہا تھا۔ اس کے مالک نے جو بھی فیصلہ کیا تھا اس فیصلے نے سلطان شاہ کو سو فیصد فائدہ پہنچایا تھا۔ مگر اب یہ مضبوط ستون کمزوریوں پڑنے لگا۔ مالک کی پریشانی اور اضطراب خادم حسین کی آنکھوں نے بھانپ لیا اور بے جہن دکھائی دینے لگا۔ اس کا بی جا اپنے مالک سے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا کر۔ سرکار خود کو مضبوط بنائیں۔ پہلے سے زیادہ اکثریں کہ آپ اسی طرح تو پیارے نکلتے ہیں مگر خادم حسین کو جرأت نہ ہو سکی سلطان شاہ نے اتنی بہت کے دی تھی۔



مراد درجنف کی بیماری کے باعث بہت دنوں بعد آفس گیا مگر وہاں اس میں ہی اٹکا رہا فون کر کے خریدت معلوم کرنا چاہی تو رابطہ نہ ہو سکا وہ مزید خود پر جبر نہ کر سکا اور اسی وقت آفس سے اٹھ گیا مگر پہنچا تو دروازہ حب معمول کھلا ہوا ہینک وہیں چھوڑ کر اندر چلا آیا۔

”اب مجھے بتاؤ آخر کب تک لٹکاؤ گے تم وہ تو شکر جان چھوٹ گئی۔ لیکن اس بڑس نے تو مجھے راری ڈالا تھا۔“ پیسے بھی لے لیے اور چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ”وہ جانے کسی سے فون پر نہ کلام تھی۔ مراد پر انکشاف۔ ہم بن کر گرے تھے۔ وہ سادگت ماوہیں کھڑا رہ گیا۔ درجنف اس کی آمد سے بے خبر کے جاری تھی۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں اگر اسے بتا دیتی تو وہ ایسا کرنے دیتا۔ میں ایسی کوئی زنجیر اپنے قدموں میں ڈالتا نہیں چاہتی جو مجھ سے میرے خواب چھین لے۔ میرے کیئر کر کوتاہ کر دے۔“ مراد نے دکھ کے شہید احساس سمیت آنکھیں تختی سے بند کر لیں کاش میں آج جلدی نہ آیا ہوتا اس کے دل سے سسکتے ہوئے دعا نکلتی تھی۔

”بس تم جلدی مجھ سے ملو میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے فلم سائن کرنا ہے۔ تم اپنے بھائی سے بات کرو۔ ملو آؤ مجھے ان سے۔“ مراد میں مزید کچھ سننے کا پارانہ تھا بے جان قدموں کو گھسیٹ کر وہ لالچ میں رکھے صوفے پر گر گیا۔ درجنف نے اس کے خون کا تھی خون نہیں کیا تھا اس کا اعتماد بھی کھیر ڈالا۔ کتنی بڑی غلطی کی تھی اس نے مگر وہ اٹلی طرفی سے معاف کر گیا۔ اب بھی وہ اسے معاف کر پائے گا؟ وہ تو عام سامان تھا اتنی بڑی آزمائش کیسے بہہ پاؤ وہ تو سیدھا سادہ سا تھا بچ بولنے والا۔

دھوکہ نہ دینے والا دل کو کعبہ کچھ کراہتا مگر نہ لایا پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔
 ”مجھے صرف اس بات کا جواب دو تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا سمجھتی تھیں مجھے کبھی نہیں ہوگی۔ کس قدر گھٹاؤ ہے تمہارا یہ خوب صورت چہرہ۔“ مراد نے اسے اپنی عدالت میں گھسیٹ لیا تھا۔ درجنف گہرا تھی پیشانی تھی شاید اسے مراد سے ایسی توقع تھی۔ مگر پھر سنبھل گئی۔

”اچھا ہوا میرا تو میں پتہ چل گیا۔ میرے لیے میرے خواب میری خواہش اہم ہے۔ میں اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ تمہیں بھی اور کیا سنا ہے۔“ وہ جھٹی تھی۔ مراد کی کشادہ آنکھیں پھٹ پڑیں۔

”درجنف! تمہیں اپنی اس غصے سے بڑھا ہوگا۔ تم نے بہت کچھ چھینا ہے مجھ سے مگر اپنی عزت میں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ تمہاری خواہش بہترین زندگی کی ہے وہ میں تمہیں

دوں گا۔ گاڑی بنگلہ آئی پر اس ووی۔ وری میں اتنی محنت کروں گا کہ تمہیں بہت جلد۔“

”یہ ڈائیلاگ مت بولو۔“ درنجف نے ہاتھ اٹھا کر اسے بدتمیزی سے ٹوک دیا۔

”یہ سہولت میں خود سے پالوں گی۔ تم بس مجھے خوشی سے کام کرنے دو۔“

”فونیور۔“ مراد چچی پڑا۔ ”ایسا ممکن ہے۔“ مت مجبور کرو مجھے کہ میں تم پر سختی کروں۔ تم نے میری محبت دیکھی ہے غصہ کو نفرت نہیں۔ میں۔ یعنی مراد احمد جو کسی غیر مرد کے سامنے تمہیں گنگے سر نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیسے تمہیں نفلوں میں جانے کی اجازت دے دوں۔“ مراد کے چہرے پر سختی در آئی تھی۔ آنکھوں سے شٹلے نکلنے لگے۔

”کیا تو تمہیں کرنا پڑے گا مراد تم کیا کرو گے میرے لیے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ڈربنا گھر اور ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی۔ یہ میرے خواب نہیں ہیں۔ تم میرے بہنوں کے شہزادے سے بھی بڑھ کر چار جنگ ضرور، لیکن مجھے خالی خالی صحن چاہنا نہیں ہے۔ ان تمام آسائشات کو پا کر تمہارے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے فخر محسوس کروں گی لیکن یہ بھی سن لو۔ اگر تم نے ضد کی اور میری بات سے اختلاف کیا تو میں ہر انتہائی قدم اٹھا لوں گی۔ تم ابھی تک مجھے سمجھ نہیں ہو سالا نکہ میں تمہیں جتنا چکی ہوں کہ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔“ درنجف نے از حد سفاکی سے کہا مراد ڈھک کر اسے دیکھتا رہ گیا پھر آہستہ روئی سے اس کے قریب آ گیا۔

”درنجف اب کونسا انتہائی قدم اٹھاؤ گی بچا ہی کیا ہے۔“ دکھ سے لہریز آنکھیں اس پر جا کر شکست خوردگی سے بولا درنجف اس کی بات سن کر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی خاصی دیر بیٹتے رہنے کے بعد ایک تیز و تھوڑی سی گلا اس پر ڈالی تھی۔

”مراد احمد! میں تم سے علیحدگی اختیار کر لوں گی مگر ظلم ایکٹر نہیں ضرور ہوں گی کیا کر لو گے تم میرا ہم ہو کیا بہت کچھ سمجھتے ہو خود کو گھر کی خبر نہیں ہے تمہیں سنو مراد احمد میں ڈانس کی تربیت لے رہی ہوں تم تو آفس ہوتے ہو۔ میں اپنی سس مانی کرتی ہوں صرف اپنی مراد اس انکشاف پر سن رہ گیا۔

”سنو مراد احمد جتنے تم سیدھے ہو کوئی مرد نہیں ہو سکتا، یقین نہیں آتا نا پھر پورا جہالت اور مردانگی اور یہ جغد قسم کی معصومیت جی جی دکھاتا ہے تمہیں مرد نہیں عورت ہونا چاہیے تناؤ وہ سنسور سے ملتی تھی پھر لہرا کر باہر چلائی جبکہ مراد اٹھا کھڑا سا وجہ کھڑا رہ گیا تھا۔



فوزیہ تقریباً چار ماہ بعد آئی تھی پہلا کارڈ اینک سے ہی ہوا اینک سے ہی یوں غیر متوقع طور پر سامنے پا کر حیرت زدہ رہ گئی پھر خوشی سے چیختی ہوئی دوڑ کر اس سے ملتی تھی فوزیہ جو اس کے بھرے بھرے جسم کو دیکھ کر لمحے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی اس کے چہرے پر پیار کرتے ہوئے شرارت سے ہنس پڑی۔

”بڑے بڑے معر کے سر کر لئے ہیں“

اس کا اشارہ سمجھ کر جھپٹ کر رہ گئی تھی پھر بات بدلے ہوئے اس کا دھیان خود سے ہٹا گئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں؟ کیا ہماری یاد نہیں آتی تھی۔“

”آتی کیوں نہیں آتی تھی تم یہ تازہ میرے بیٹے کا خیال رکھا۔“ وہ اسامہ کو بھیج بھیج کر پیار کرتے ہوئے بولی اینک نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”یہ صرف تمہارا بیان ہے جو ایسا کہہ رہی ہو۔“ فوزیہ جھٹلے لیتے ہوئے ہنس دی پھر جیسے کچھ سوچ کر رازداری سے اس کی سمت جھکی تھی ”کون سا مہینہ ہے؟“

”اپریل۔“ اینک نے ناگہبی کے عالم میں بھولیں سے فوری جواب دیا۔ فوزیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”تیرے قلوب میں پوچھ رہی ہوں کون سا مہینہ ہے؟“ اس کے سر اچے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی اینک کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”چھٹا۔“ اس نے بمشکل یہ لفظ ادا کیا تھا۔

”وہ اس کا مطلب ہمارے یہاں۔۔۔۔۔“

”پلیز فوزیہ۔“ اینک نے سخت سے سرخ پڑتے چہرے سمیت حاجت سے کہا تب فوزیہ کو بھی جیسے اس پر رحم آ گیا۔

”اُن سے محبت کرنے لگی ہو؟“ فوزیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر رازداری سے پوچھا اینک کی آنکھیں یکجہت پابنوں سے بھر گئیں۔ اعتراف جس قدر دشوار تھا فرار اس سے زیادہ کٹھن وہ سر جھکائے ہوئے کپٹنے لگی۔

”چلو اس کا مطلب تم بھی عقل گاہ کی جانب چلیں۔“ فوزیہ نے سر دباؤ بھری تھی۔

”تک کیا مطلب؟“ وہ ہنستا کر بولی۔

”مطلب سلطان شاہ سے محبت کرنا کیا مرنے کے مترادف نہیں۔“ اینک کے گلے میں آنسوؤں کا کولا سا انک گیا مزید وہاں ٹھہرا نہ گیا تو اٹھ کر جیزی سے اندر چلی گئی فوزیہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی تھی۔



”پھر کیا سوچا تم نے مراد احمد؟“ رات وہ خاما صلیب آیا تھا۔ کھانا کھائے بغیر بستر پر راز بے خواب آنکھیں چھت پر جمائے حالات کی تتم نظریں پر فنیہر دوہا طول ہو رہا تھا جب جھٹکے سے دروازہ کھول کر درنجف اندر آئی اوپر یہ لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ مراد نے خالی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا پھر گہرا سانس بھرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جانتے بوجھتے بھی کہ دانستہ انجان بنا دراصل وہ اس موضوع سے کترار تھا۔

”بھولے مت۔ نومراد احمد! تم جانتے ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں کیا فیصلہ کر پائے تم مجھے بتاؤ؟“ وہ شاید اس سے زیادہ دیرداشت نہیں رکھتی تھی جی جی پڑی مراد نے اس کے پیچھے کی پروا نہیں کی اور اس درجہ اطمینان سے بولا تھا۔

”وہی جو کل تھا۔“

”یعنی تم مجھے نفلوں میں کام نہیں کرنے دو گے۔“ درنجف نے تیوری جہا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ مراد نے ہنوز سی انداز کو اپنائے رکھا کویا اسے ہلارہا تھا۔

”لو کہ تو پھر مجھے طلاق دے دو۔“

”شٹ اپ۔“ مراد نے ڈانٹا مگر وہ جیسے سن نہیں رہی تھی۔

”میں تم پر اپنا مستقبل بچھاؤ نہیں کر سکتی۔ اپنی شدید خواہش کو تمہاری ضد کی بھیبت نہیں جہا سکتی۔“

”درنجف تم ہوش میں ہو بند کرو یہ بکواس۔“ مراد نے غصے سے لرزے ہوئے کہا۔

”ہوش تو تم نے کھوئے ہیں مراد احمد! میں تو تم جیسے انا پرست ضدی شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تم مجھے چھوڑ دو جان بخش دو میری۔“

”مراد اسے بھیجی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

”ہوش بعد میں کھٹا مجھے فارغ کرو۔ طلاق دو مجھے ابھی اور اسی وقت۔“ وہ ہسٹریک ہو کر چیختے ہوئے اسے جھنجھوڑنے لگی مراد نے سخت ٹپش کے عالم میں اسے جھٹک دیا۔

”درنجف گلتا ہے آپ پاگل ہو گئی ہیں جیسی ایسی باتیں کر رہی ہیں کوئی بھی مرد ایسی بات اپنی بیوی کے منہ سے سننا پسند نہیں کرنا مگر میری مجبوری سمجھ لیں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ کو کوئی نہیں دینا چاہتا آپ اس وقت جذباتی ہو رہی ہیں سو جائیں پھر بات کر لیں گے۔“ مراد نے اندر رائدے شدید اشتعال کو دبا کر زری سے بات کی کویا اسے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر وہ جو بے بہت نظر بیٹھ ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی نہ ہر خند سے ہنس پڑی۔

”بس فحتم ہو گئی تمہاری تقریر تم مجھ رہے ہو فحتم اس طرح مجھے دکھ دو گے دکھ تو اس طرح دے رہے ہو طلاق دے دو مجھے میں شانت ہو جاؤں گی بے زار ہو گئی ہوں میں تمہاری صورت سے تمہارے اس گھر سے اب کل کے سانس لینا چاہتی ہوں اور ایسا کرنے سے تم مجھے روک نہیں سکتے۔“ مراد کی آنکھوں میں سرخی اتار آئی۔ جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ بولا تو لہجے میں سے آگ برسنے لگی۔

”تو پھر سنو درنجف بیگم! میں تمہیں کسی طلاق نہیں دوں گا آج کے بعد تم گھر سے بھی باہر نہیں نکلو گی اگر میں نے تمہیں باہر دیکھا تو ناگہلی توڑ کے رکھ دوں گا یا اس خوش نما چہرے پہ تیزاب پھینک کر ساری خوبصورتی مٹا دوں گا۔ اسی پیمانے پر تمہیں یہ نہیں رہے گا تو بھگتا ختم ہو جائے گا۔ تم جو سس مانی کر چکی ہو فحتم اب اور نہیں۔“ اسے بیڈ پر ٹھیک کر باہر نکال گیا جبکہ درنجف جنونی انداز میں ہنسنے لگی تھی۔



اینک بیٹھ داور ملک کی الکتی کو لادائی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک بے پناہ محبت چاہت اور اہمیت کو وصول کرتے ہوئے اسے کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ بے قدری کیا چیز ہوتی ہے۔ اسکول کالج یونیورسٹی میں بھی وہ اپنی ذہانت اور حسن کے بل بوتے ہمیشہ خاصی گروائی گئی تھی مگر جب سے اس گھر میں آئی تھی اتنی تذلیل سہی تھی کہ خود سے نگاہ لاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی۔ فوزیہ آگئی تھی اس نے جان لیا۔ اب سلطان شاہ کو اس کی نہیں فوزیہ کی ضرورت تھی جیسی مزید تھیک سے بچنے کی خاطر ان خود ہی اپنے بیڈروم میں شٹل ہو گئی۔ رات وہ تقریباً غنودگی میں تھی۔ جب فوزیہ نے اسے اکرا سے بولکھلا کر رکھ دیا۔

”تمہیں بلار ہے ہیں۔“

”واہ؟“ اس کے سر پر کوا دھاک ہو ا تھا۔ دن بھر ہونے والی کارگزاری میں وہ اپنی خطا سوچنے لگی۔ جس کے جرم میں اس پر توبیہ ہوئی تھی۔

”کیا سوچے لگیں۔ ہری اپ پلیز۔“ فوزیہ نے اسے گم سم اور قدر سے خواہاں بندہ دیکھ کر کندھا تھام کر گھنٹھوڑا۔ وہ ہری طرح سے چونک گئی۔ پھر نائٹ ڈریس پر مثال اچھی طرح پھیلاتے ہوئے اٹھ کر رہ لے لے ہوئے دل سے دعائیں مانگتی سلطان شاہ کے روم تک آ کر اکرا کیا تھا پھر ہلکے سے تاب گھا کر اندر داخل ہو گئی۔ سلطان شاہ آہٹ پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھیں تم؟“ اس کا چہرہ ہر خت اور آنکھیں تلخی سے سوتے تھیں۔ اینک کی پتیلیوں میں پسینہ اترنے لگا۔

”اپنے بیڈروم میں۔“

”کس نے اجازت دی تھی کیا میں نے تمہیں جانے کے لیے کہا تھا؟“ وہ پتھکارا اینک اس کا گڑبڑا ہوا سو دیکھ کر خوف سے لرزے لگی۔

”نہیں۔“ ہنکاتے ہوئے بمشکل بول پائی۔

”تو پھر تمہیں جرات کیسے ہوئی۔ اپنی اوقات میں رہو سمجھیں۔“ اس کا بازو سلطان شاہ کی آغوشی گرفت میں کسا جا چکا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں ابالاب

پانیوں سے بھر گئیں۔

”کیا سمجھنے لگی ہو تم خود کو۔ میں نے تنبیہ کی تھی۔“

”جی جی۔“ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش میں سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

”پلیز مجھے چھوڑ دیں۔“ اس نے کروڑ کر منت بھرے لہجے میں کہا۔ سلطان شاہ کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔

”دن ہو جاؤ یہاں سے۔“ اسے جھٹکے سے دور کرتے ہوئے دھرخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ امین خود کو سنبھالتی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔



طبیعت زیادہ تراب ہونے کے باعث مراد جلدی آفس سے گھر آ گیا۔ رات بھی اسے حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ جواب تیز بخار میں بدل گئی تھی۔ پچھلے کئی دنوں کے ذہنی خلجان نے اسے تیار کر ڈالا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا اب اس کے لیے باعث حیرت نہ تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کرنا ہوائی وہ اندرونی حصے کی جانب بڑھتا تھا بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا کھڑا ہوا تھا۔ کمرے سے سرکوشیوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ مراد پھر بھی نہیں چونکا۔ اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ درجنف کو کسی بھی وقت ایکٹک کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ دروازہ کھل کر اندر داخل ہوتے ہی وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ نہ قدموں تلے زمین سر کی تھی نہ آسمان ٹوٹا پھرتا کچھ بھی نہ ہوا تھا مگر مراد احمد پر قیامت ٹوٹ گئی۔ درجنف آرزو کے ساتھ تھی اور دونوں جس قابلِ اعتراض حالت میں تھے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی مراد غیر یقین سماتا تھا۔ درجنف بے باک تھی بولڈ تھی مگر بدرامہ ہو گئی یہ تو اس نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا۔ دونوں جانے کب سے اس کی آنکھوں میں دھول چھوٹ کر رہے تھے اور وہ بے خبر رہا تھا۔ مراد نے لڑکھڑاتے ہوئے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔ اسے خود کو کمزور کرنے میں خاصی رقت کا سامنا تھا جبکہ وہ دونوں اس کی آمد سے بے خبر اس قدر کھوئے تھے کہ آس پاس کی خبر نہ تھی۔ مراد کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر جیسے وہ اپنے حواس کھو گیا تھا۔ دروازے کو زوردار دھوکا رسید کرتے ہوئے چیخا ہوا آواز پر ٹوٹ پڑا۔ آرزو اس کا چمک اٹھا۔ اس کے فطری تار نہ تھا۔ مراد کو سامنے پاتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بوقتِ تو درجنف بھی تھی مگر جلد سنبھل گئی۔ اس اثنا میں مراد نے آرزو کا اچھا خاصا حلیہ بگاڑ ڈالا۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دینے نہ تھا کئی کر رہا تھا۔

”مراد امیری بات تو سنو۔“ آرزو اپنا چہرہ اس کے گھونٹوں کی زد سے بچاتے ہوئے چلایا۔

”کئی سے شٹ اپ‘ مت نام لو اپنی گندی زبان سے میرا میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔ تم نے میرا اعتماد ڈاڑا۔“ مراد نے مثل کا گلدان اٹھا کر اس پر دے مارا۔ آرزو کا چہرہ بدبو لہان ہو گیا۔ اس نے قہر میں کہ مراد مزید کوئی ایکشن لینا آرزو کو بھانگے کا موقع مل گیا۔ مراد نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ منٹھیاں پھینچتے ہوئے درجنف کی طرف پلٹا جس کے چہرے کا سارا خون آرزو کا شہر دیکھ کر کچھ چکا تھا۔

”لو تم۔“ اس نے اٹھ لی اٹھا کر اسے گھورا۔ درجنف بے ساختہ سسکی ہوئی اس کے سینے سے آگئی۔

”مراد اوہ..... وہ مجھے زبردستی۔“ مراد نے نہایت تحارت سے اسے جھٹک دیا۔

”دور رہو مجھ سے گھن آ رہی ہے مجھے تمہارے لمس سے۔ تم قاتل ہو میرے اعتماد کی امیری نسل کی اور میری خوشیوں کی بھی۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ کتنا بے وقوف تھا میں تم سے محبت کرتا رہا۔ تمہارے دل میں اپنے لیے محبت تلاش کرتا رہا۔“

”پلیز مراد امیری بات سنو۔ آرزو نے زیادتی کی ہے مجھ سے۔ پلیز مراؤ سٹی۔“

”شٹ اپ اب میں تمہارا کبھی یقین نہیں کروں گا تمہارے آنسو جھوٹے ہیں تمہاری زبان اور دل کی طرح۔ تم چاہتی تھیں میں تمہیں خلاق دے دوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ جلی جاؤ ہمارے درمیان وہ بندھن ٹوٹ گیا جسے تم نے دل سے باندھا نہ قبول کیا اور رشتے دل سے ہی ہوا کرتے ہیں۔ خون کے رشتے ٹوٹ بھی جائیں دل کے نہیں ٹوٹا کرتے۔ شام میں میں آؤں تو تم یہاں نظر نہ آؤ۔“ وہ چلتا تھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ درجنف لمبی تھی اور ہنستی چلی گئی۔



فوزیہ کو آئے ہوئے بھی مہینہ ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب ملازمین بھی واپس آ گئے تھے۔ امین کو خاک سمجھ نہ آ سکی۔ سلطان شاہ کے اس اقدام کے پیچھے کیا اسرار تھا۔ شاید وہ اس کا ضبط آزما چاہتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس کے نزدیک یہ بات اہم نہیں تھی۔ خود پر پڑنے والی اس آزمائش میں ہی اس نے جانا تھا۔ عورت موسم کی طرح حرم ہوتی ہے۔ حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں دیر نہیں لگاتی۔ اس نے یہ سب کام نہیں کیے تھے تو کیا ہو اگر یہ سب کچھ اس کی فطرت میں موجود تھا۔ جسے اس نے قبول کر لیا تھا ان دنوں اس کی حالت کے پیشِ نظر فوزیہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ دوسرے ملازموں کی موجودگی میں کام رہے بھی نہ تھے۔ اسامہ کی ذمہ داری بھی اب فوزیہ پر تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے سلطان شاہ اس سے لائق بنا ہوا تھا۔ شام کی ٹیبل اور کھانے کے وقت ہی اس سے سامنا ہو پاتا مگر امین اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں جو اس کے جسم کی ہیئت ہو رہی تھی۔ اسے سلطان شاہ کے سامنے جاتے ہوئے بے تحاشا شرم محسوس ہوتی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی خصوصاً اس پر شک نہیں ڈالتا تھا۔ پھر بھی امین جھٹک جاتی چونکہ فراغت تھی اور خالی ذہن سوچوں کا گھر ہوتا ہے سو اس نے بھی بے شمار لامعنی سوچیں پال لی تھیں۔ جانے کیوں وہ بے مقصد سلطان شاہ کو سوچتی رہی۔

اس وقت بھی سلطان شاہ کی بے نیازی حد سے زیادہ سلسلش سوچ اور غور و درخوش کے بارے میں فکر مند سی سوچ رہی تھی جیسی ذہنی رو بہک گئی۔ جب یہ غصے میں تانا بندا ہوا وقت گزرتا رہتا اور بے نیازیوں میں اتنا چلتا ہے تو مسکراتا ہو یا ر کھاتا ہو اس قدر بیدار لگے گا۔ اپنی سوچ چر وہ خود ہی مسکرا دی۔ تھی سلطان شاہ کو کچھ کر چوکتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ سلطان شاہ نے وی لاؤنچ سے ہوتا تیز قدموں سے بیڈروم کی سمت چلا گیا تھا۔ پیچھے پیچھے گھبرا ہوا بھٹکا یا خادم حسین بھی تھا۔ جس کے پیچھے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سلطان شاہ کی سفید برق شرٹ خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ مٹی تیزی سے وہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی اور جس رفتار سے دل نیچے گہرا یوں میں ڈوب رہا تھا اگر حواس سلامت ہو تو خود بھی ششدر رہ جاتی۔ سر پٹ بٹھ گئے ہوئے وہ دروازے سے اندر آئی فوزیہ سے ٹکرائی۔ فوزیہ بھی یقیناً سلطان شاہ کی خون آلود شرٹ دیکھ چکی تھی۔ جیسی متحش سی دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں۔ دونوں ہی حراساں وجے کل تھیں۔ آنکھوں میں بہت سے سوال وضاحت بھر رہے تھے۔

”وہ تم نے دیکھا سلطان شاہ؟“ امین کی دلی کیفیت لہجے کی لرزش اور نئی سے عیاں تھی۔

”ہاں مگر تم یہاں بیٹھو۔“ فوزیہ نے حواس قابو میں کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے جا جا چا ہا مگر وہ بری طرح بھل کر اپنا آپ چھڑا گئی۔

”نہیں مجھے اندر جانے دو۔ انہیں چوٹ آئی ہے۔ ہماری ضرورت ہوگی۔“

”نہیں امین! میں تو نہیں بتا رہی ہوں۔ جب خادم حسین ان کے ساتھ ہو پھر انہیں کسی اور کی طلب نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔“ فوزیہ نے دوبارہ اس کا بازو پکڑا جسے امین نے درجنف سے جھٹک دیا۔

”میں ضرور اندر جاؤں گی۔ چھوڑو تم مجھے۔“

”امین! امین!“ فوزیہ اسے پکارتی رہی مگر وہ نظر انداز کیے تیزی سے سلطان شاہ کے بیڈروم میں آ گئی۔ سلطان شاہ شرٹ کے ٹٹن کھولے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا تھی اس کی نگاہ امین پر جا پڑی۔

”ٹٹک کیا ہوا ہے آپ کو؟“ امین لپک کر قریب آتے ہی بے تابانی سے بولی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ سلطان شاہ نے جھٹک کر شرٹ اتار کر دور پھینکتے ہوئے غصے سے کہا۔ امین نظر انداز کیے قریب آ گئی۔

”کہاں رخم ہے مجھے دکھائیں۔“ سلطان شاہ اس پر سر دنگہ ڈال کر میڈیکل کس لیے اندر آتے خادم حسین کی سمت متوجہ ہو گیا۔ تھینا اسے کوئی لگی تھی۔ داہنے شانے سے ذرا نیچے بازو کی طرح ڈھکی تھی۔ خون ابھی تک نکل رہا تھا۔ امین کا اسے دیکھ کر دل ہی ڈول کر رہا جبکہ وہ یوں اطمینان سے کھڑا تھا جیسے کچھ ہو ہی نہ ہو۔ خادم حسین اس کے اشارے پر ہی رخم صاف کرنے لگا تھا۔ سلطان شاہ کی ہدایت کے مطابق رخم گرم پانی اور اسپرٹ سے دھو کر پٹی باندھ دی۔ امین دادرزوب سے اس کے لیے شرٹ نکال لائی۔

”اب تم جاؤ خادم حسین۔“ خادم حسین فوری حکم بجالایا۔ امین تیزی سے آگے بڑھا آئی۔

”آپ کو گرم دودھ کی ضرورت ہے۔ آپ یہ شرٹ پہن لیں۔ پھر میں دودھ لاتی ہوں۔“ امین نے شرٹ اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا اور انہیں سلطان شاہ کا ضبط چھٹک گیا۔

”کوہٹ اپ تو اب تم مجھے بتاؤ گی مجھے کیا کرنا ہے۔“ وہ پھنکارا تھا اور سخت قہقہے کے عالم میں اسے پیچھے دھکیل دیا۔ امین خود کو سنبھال نہ سکی منہ کے بل گرتی مگر اس سے پہلے ہی جانے کس جذبے کے تحت سلطان شاہ اسے بازوؤں کے مضبوط حلقے میں محفوظ کر لیا۔ امین کی سانسیں اٹھل پٹھل ہو گئیں۔ سلطان شاہ اگلے ہی ہل اسے جھٹک چکا تھا تھا۔

”دن ہو جاؤ اگر اس حال میں نہ ہو تمیں تو اس گستاخی کا انجام ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں۔ اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے وہ سر دلچے میں غرایا۔ امین کی آنکھیں ڈب ڈب لگیں کتنی جلدی اوقات یاد دلادی تھی۔ ابھی تو وہ پوری طرح خوش فہمی کو پال بھی نہ سکی تھی۔ خوش ہونے بھی نہ پائی تھی۔ تم پتھر ہو سلطان شاہ کیا جانتا تمہارا جو میری خوشی کو خوش فہمی رہنے دیتے آنسو پیتے ہوئے وہ سسکیاں روکتی بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔



درجنف خوش تھی۔ اپنی آزادی پر کوہیا جشن منا رہی تھی۔ مگر ماں گھر سے سوگ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ مراد سے طلاق لینے کی بات اگرچہ اس نے ماں کو بتانے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یہ الزام اس پر ہی لگنا چاہتا تھا مگر ماں ماننے سے انکاری ہو گئیں۔ انہوں نے بری طرح سے درجنف کو بیٹ ڈالا۔

”امی مجھے ہی بددعا تھا تجھ سے ہر وقت سولی پر لگی رہتی تھی۔ کیا لگیا تجھے تاتو سہی۔ جانی نہیں ہوں کیا تیرے لیے لکھن۔ ارے وہ تو بہت سیدھا بچہ تھا۔“ درجنف کا صلی کڑا ہوا گیا ماں کی گالیاں کو سننے کو سخت بد مزہ ہوتے ہوئے بد حالٹی سے چلا اٹھی۔

”ہاں میرا ہی تصور ہے۔ میں نے ہی طلاق لی۔ کہا تھا تم سے ماں مجھے شادی نہیں کرنا۔ اب دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ۔ مجھے اب تم بھی فلموں میں کام کرنے سے نہیں روک سکتیں۔“

”کیا ہے ان فلموں میں۔ آئیہ کو دیکھا مجبوری تھی جب نہیں رہی تو گھر بسلا۔ کبھی اسے دیکھنا اسے اگر غیرت پکڑنی ہو تو بہت مثالیں۔“

”تم میرے معاملات میں امت بولو ملاں۔ مجھے اپنی مرضی سے بھیجے گا پورا حق ہے۔ دیکھنا میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤں گی یہ مراد احمد تو کیا اس طرح کے ہزاروں میرے قدموں کی خاک مٹا اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔ اسے چھوڑ کر میں نے اپنا نقصان نہیں کیا ملاں بلکہ خوش بختی کے دروازے پر دستک دی ہے۔“ کہاں نے اسے ہنس بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر جیسے پھٹ پڑیں۔

”لعنت ہے تیری سوچ پر مری تجھے کیا خبر تو نے اپنا کیا نقصان کر لیا۔ قسمت سے ایسا مر دلا تھا جس کی تو نے قدر نہ کی۔ اپنی کوکھ اپنے ہاتھوں بھلا ڈالی۔ بول کون نگلے لگے گئے تجھے کرموں میں چلی تجھے تو درور کی ٹھوکریں کھانا چیں۔ ابھی کہاں تجھے احساس ہو گا کبھی روئے گی سر تھاں کر۔“ انہوں نے منہ پر چادر ڈالی اور رونے لگیں۔ درجنف نے ان کی گریہ زاری کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے بس کھول لیا اور وہ زور پور ت نکال کر دیکھنے لگی۔ جو وہ مراد کے گھر سے آتے ہوئے سمیٹ لائی تھی۔



فوزیہ نے امین کا ماتم شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر کے پاس لکھوایا تھا۔ وہی اسے ہر بار چیک اپ کے لیے لے جایا کرتی۔ امین کی کنڈیشن کے پیش نظر ڈاکٹر خاصی فکر مند تھی۔ مقررہ ڈیٹ سے ایک دن پہلے ہی امین ہسپتال جانے کو تیار ہو گئی۔ چند روز قبل ہی ملا بھی اسے ملے آگئی تھیں۔ بہت مضطرب محسوس کیا تھا۔ امین نے انہیں۔

”تم خوش تو ہو امین؟“ اور امین ہنس دی تھی۔ عجب کھوکھلی سی ہنسی اب کیا فائدہ اب تو ہم ہاری چکے اپنا آپ اس نے مٹل سوچا تھا۔ اما کوڈ مڈس بندھ چکی تھی۔

”میں بہت خوش ہوں ماما! آپ پریشان نہ ہوا کریں۔“

”جب تم فارغ ہو جاؤ تو پھر ضرور آنا۔“ ان کے لہجے میں امین کے لیے وہی محبت تھی وہ سکرادی جبکہ ماما جیسے کچھ یاد آنے پر اس کی سمت جھک کر راز داری سے بولی تھیں۔

”سلطان شاہو! اچھا ہے ہمارے ساتھ؟“

”جی۔“ وہ یہاں بھی اپنا دیکھنا بند کر چکی۔

”جیسے تو سلطان شاہ بہت پیارا بچہ مگر عادتیں کچھ عجیب سی ہیں۔ سنو کیا اب بھی جو اکیلے ہے۔ سنا ہے بہت خطرناک کام کرتا ہے موت کو گنگے لگانے والے۔“

”جی۔“ امین سشدرد ہو گئی۔

”میٹی! اسے سمجھاؤ! آفریکا کر کے گاتانی دولت جمع کر کے۔ یوں بھی دو شا دیاں تو کر چکا ہے۔

اس کے پاس ملا کی کسی بھی بات کا تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ آج کل تو وہیں بھی دل بہت بوجھل سا رہا کرتا تھا۔ اسے آنے والے وقت نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ جو زندگی اور موت کا مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ اسی رات سلطان شاہ نے کھانے کی ٹیبل پر کہا تھا کہ کل وہ ہسپتال چلی جائے مجھے عورتوں کا رونا بچنا کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے یہ کہتے ہوئے امین نے اس کے وجہ چہرے پر زمانے بھر کی بے زلمی اور نا کواری محسوس کی تھی۔ آنکھیں حسب معمول سلک رہی تھیں۔ فوزیہ صبح سے اس کی تیاریوں میں لگی تھی۔ ملازمہ اس کے ساتھ جاری تھی جبکہ خادم حسین گاڑی لیے بالکل تیار تھا۔ امین خوب بڑی چادر میں لپٹا وجود چھپائے سست روئی سے پورچ تک آتی تھی، ابھی سلطان شاہ کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی اور پوریکو میں آن کر جھٹکے سے رک گئی۔ خادم حسین نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔ باہر نکل کر وہ سیدھا اس کی جانب ہی چلا آیا۔ امین جو بے خیالی میں اسے دیکھے جاری تھی یک دم ہی چوک کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگی۔

”رکو۔“ سلطان شاہ کی خشک آواز پروہیکا کی انداز میں سیدھی ہو گئی۔

”تمہیں یاد تو ہو گا میں نے کیا کہا تھا تم سے۔“ سرسری سی نگاہ اس کے سراپے پر ڈال کر وہ سر جھکے میں مخاطب ہوا تھا۔ امین کی آنکھیں بھری چٹکے میں سوال لگا آتا لیکن کچھ بول کر اس کا تہرہ خود پر برسا نہیں چاہتی تھی۔

”واہی پر تمہارے ساتھ میری ولاد بیٹی کی صورت میں ہونی چاہیے۔ یہ تو تمہیں پتہ چل گیا ہو گا میں بہت شدت پسند ہوں۔ بیٹا صرف بیٹا۔ ورنہ جو ہو گا اس کا تمہیں اندازہ ہی ہو گا۔“ امین جوبل بھیجنے خاموش اس کی دھمکی آمیز گفتگو سن رہی تھی۔ مزید مضبوط نہ کر سکی تو تلخ ہنر میں کویا ہوئی تھی۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ سلطان شاہ کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اولاد مرکا نصیب ہوا کرتی ہے۔ جو آپ کے نصیب میں ہو گا وہی ملے گا۔ البتہ آپ کا غرور دیکھتے ہوئے میرا بچہ چاہ رہا ہے۔ آپ کو بددعا دوں آپ بیٹی کے باپ نہیں تاکہ آپ کا یہ غرور اور ضد منہ کے بل جا پڑے۔“ ضبط کی کوشش میں سلطان شاہ کا چہرہ ہلک کر اٹھ رہا ہو گیا اگرچہ خادم حسین انہیں باتیں کرتے دیکھ کر خامسے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ اس کے باوجود سلطان شاہ نے نگاہ اٹھا کر اسی سمت دیکھا پھر قدم بڑھا کر امین کے بالکل قریب آن رکھا۔ اس کے چہرے کے غضب ناک تیز نور آنکھوں سے لڑتا خون امین کو اندر سے لرزہ کیا مگر بظاہر اسی مضبوطی سے کھڑی رہی۔ سلطان شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام کر جھٹک دیا۔ امین لوکھڑا کر اس کے سینے سے آگئی۔

”اس وقت اس لیے چھوڑ رہا ہوں تمہیں کہ میرے بھکرے کٹڑے کو اپنے وجود میں چھپائے کھڑی ہو لیکن جب لوگوں کی خواہش پوری نہ کی تو یہ تمہاری بددعا کا اثر ہو گا اور اس کی کیا کڑی سزا ہو گی یہ وقت بتائے گا۔“ ایک ایک لفظ جبارا کرتے ہوئے وہ بھوکے شیر کی مانند غرا رہا تھا۔ اس کی گرم سانسیں امین کا چہرہ جھلسا رہی تھیں۔ امین کی ساری بھاری دھری دھری ہو گئی۔ اسے اپنا آپ ٹوٹا ٹکڑا محسوس ہوا۔ سلطان شاہ جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ کر پوریکو سے چلا گیا۔ امین نے خود کو گرنے سے بچانے کی خاطر گاڑی کا کھلا دروازہ تھام لیا۔ خادم حسین سلطان شاہ کے جاتے ہی ادھر چلا آیا۔ ملازمہ بھی اسی وقت باسک اٹھائے بیٹھی تھی۔ امین نے خود کو کیٹ پر گر کر اگر اسانس کھینچا۔ اب اس کا دل گرگڑا کر خدا کے حضور سلطان شاہ کے لیے بیٹے کا طلبکار ہو گیا۔



درجنف نے آزر کو ایک ہفتے بعد بلا لیا۔ وہ مدت گھر بیٹھ کر گزار رہا نہیں چاہتی تھی۔ جو کچھ بھی کرنا تھا وہ بہت جلد کرنا چاہتی تھی۔ مراد احمد اس کا بہت وقت ضائع کر چکا تھا مگر ایک ہفتہ تو کیا ایک مہینہ گزر گیا آزر کو نہ آنا تھا نہ آیا جیسے جیسے وقت بیت رہا تو درجنف کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آزر سے رابطے کے لیے فون کیا مگر وہاں سے عقدہ کھلا اس گھر میں آزر نام کا کوئی شخص رہتا ہی نہ تھا۔ اب صحیح معنوں میں درجنف کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ آزر تو اسے ابھی پچھلیکٹ نمبر دے گیا تھا۔ اب جانے فون رسیو کرنے والے نے جھوٹ بولا یا آزر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا، مگر آزر کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی تھی اور پھر سے وہی نمبر گھما دیا۔ آزر سے متعلق استفسار پر فون سننے والا اس سے الجھ پڑا۔

”بی بی! آپ کون سی زبان سمجھتی ہیں۔ میں بتا چکا ہوں یہاں آزر نام کا کوئی شخص نہیں رہتا آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔“ اور درجنف کو یقین آ گیا آزر کی دھوکہ دہی پر بھی اس بات پر بھی کہ یہ لہجہ آزر کا ہے کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کتنی بھولت سے وہ اسے برا دکر کے لوٹ گیا۔ اس کی کمزوری کو جانا اور اپنا مقصد عمل کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔ اب اسے یاموس ہونا چاہیے تھا۔ عبرت حاصل کرنا چاہیے تھی مگر وہ بھی درجنف تھی آزر کا آسرا چھوٹا تو آسیہ کے پیچھے پڑ گئی۔ کوکہ آسیہ کی شادی ہو جانے کی صورت میں یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا مگر درجنف کوشش ترک کرنا نہیں چاہتی تھی اسے ہر صورت اپنے خوابوں کی تعبیر پانا تھی۔



چوتیس گھنٹے زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد امین نے ایک خوب صورت اور صحت مندی کو جنم دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نگاہوں نے سلطان شاہ کو کھانا تھا مگر نام لوٹ آئیں۔ ملازمہ کرسی پر بیٹھی لوگھ رہی تھی۔ اس کی کراہیوں پر ہڑ بڑا آگئی۔ امین کو ہوش میں دیکھ کر سرعت سے اٹھ کر اس پر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔

”کچھ چاہیے بی بی! امین ڈاکٹر کو بلائی ہوں۔“

”پپ۔۔۔۔۔ پانی۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل کہا ملازمہ نے فوراً آگے بڑھ کر گلاس میں پانی نازل کر دیچے کی مدد سے اس کے منہ میں پکا دیا۔

”مہر ایچ کہاں ہے؟“ ملازمہ کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے اس نے غمازت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”بچہ؟“ ملازمہ تو پہلے کبھی نہیں پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”بی بی جی! بچہ نہیں بچی ہے۔ کیا پریوں سا روپ ہے۔ کچھ بہت کیوٹ ہے بالکل آپ کی طرح۔“

”کیا؟“ امین کا دل دھک سے رہ گیا۔ سلطان شاہ کا غصہ لیا چہرہ تصور میں لاتے ہی دوسرا پالٹا ہوا تھا۔ اف اس نے شدید کرب سے آنکھیں موند لیں تھیں۔ دو

شخاف قطرے پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر بالوں میں جذب ہو گئے۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ جانتے ہی دیک سکتی رہی۔ ملازمہ سر جھکائے مدام ہی کھڑی تھی شاید مجھے ابھی بی بی جی کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔

”کیا سلطان شاہ آئے تھے؟“ خاصی دیر بعد خود کو سمجھا لیا کہ اس نے بڑی آس سے ملازمہ کا چہرہ دھکا۔

”نہیں۔“ ملازمہ جھک کر کھاتے سے بیٹی کو اٹھاری تھی۔ اس کی بے قراری محسوس کیے بنا سرسری سے لہجے میں بولی تو امین کو یک دم ہی غصہ آئے لگا۔

”تم نے بتایا ہو گا تو آئیں گے۔ جاذبون کرو انہیں۔“ شاید ٹوٹی آس کا سراوہ اتنی آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی جھنجھلا کر بولی تو ملازمہ کی نگاہوں میں اس کے لیے عجیب ترحم آمیز کیفیت لہڑائی۔

”نہیں بی بی جی! میں نے پہلے فوزیہ بی بی کو کہا تھا پھر صاحب کے موہا بل پر رینگ کر کے انہیں بھی آگاہ کیا تھا۔“ سرخ کھیل میں لٹیٹی بچی اس کے پیلو میں لٹاتے ہوئے ملازمہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

”وہاں کی گاڈ! اس نے تجھے پر مضطرب انداز میں سر جھکا۔ کیا رد عمل ہوا ہو گا تمہارا سلطان شاہ۔ تھینا غصے میں ہوں گے اور مجھے کوس رہے ہوں گے کہ میری بددعا تمہیں لگ گئی۔ اگر میں تمہیں بتاؤں صرف تمہاری خاطر میں نے رب سے بیٹا مانگا تھا تب تم کبھی مجھ پر یقین نہ کرو۔ اس نے کہنی کے بل اونچا ہو کر بچی کی من موہنی سی صورت نکلی اور نہایت ٹیشن کے باوجود جی مسکرا دی۔ کاش سلطان شاہ تم سچے سکویہ بددعا نہیں یہ تو کسی خاص لمحے میں مانگی گئی خوب صورت دعا ہے۔ کون سول گلابی بچی پر غم سے آزار لانی پلکیں گالوں پر سجائے گہری نیند میں تھی۔ امین نے ماتا کے جذبے سے معمور ہو کر اس کی پشیمانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ خدا تمہارا نصیب اچھا کرے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی تھی اور پھر جانے کس جذبے کے تحت پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔



آسیہ کو اس کے حالات جان کر شدید دھچکا لگتی ہی دیر وہ گنگ سی ٹھہر رہی تھی۔

”بہت غلط ہو! بہت ہی غلط! کہ لاؤ درجنف تم نے اپنے ساتھ مجھے دیکھو میں نے اس لائن کو چھوڑ کر گھر بسایا اور تم نے بسا بسا گھر توڑ دیا اپنے پاؤں پر خود کھاڑی ماری۔

ارے کس عزت و شہرت کی بات کرتی ہے۔ عورت کی عزت صرف گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہے۔ لوگ تو آفس اسکول اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کو نہیں بخشے اور تو فلموں سے عزت کمانا چاہتی ہے۔ افسوس ہو! تم جتنی بھی فلمی دنیا کی قد رصنوی دنیا ہے۔ محض تصویراتی ہے۔ نرا ایکٹریس فلم ایکٹریس کو لوگ پبلک پر ہارٹی سمجھتے ہیں۔ تم نے ایک عطلی کر لی ہے مگر دوسری مت کرو۔ دکھو اگر وہ صرف عطلی تھی تو یہ فائن عطلی ہو گی۔ خاص طور پر یہ فلمی دنیا بہت سیاہ دنیا ہے۔ نرا گناہ عاقبت دنیا کیس بھی لمان نہیں رہتی۔ کیس بھی سکون نہیں ملتا۔ مجھ سے پوچھو نجف میں جاتی ہوں اس لیے میں نہیں جاتی میرے بعد تم وہی رقم کھاؤ۔

”مجھے آپ کی تقریر نہیں سننا آتا میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر تم میری کچھ مدد کر سکو۔“

”نہیں نجف! آئی ایم ساری۔ میں کچھ نہیں کر سکتی میں نے خود سے ہی نہیں خدائے بھی عہد کیا ہے کبھی ادھر نہیں بیٹوں گی پھر تمہیں کیسے غلط راستے کا پتہ بتا دوں۔“

”دور نجف کو آئیہ کے انکار پر غصہ آ گیا وہ دل میں بغض لیے اٹھی تھی اونہ۔ طلیٰ ہیں یہ آپا مجھ سے تو بھلا میرا موازنہ اپنے آپ سے کر رہی ہیں۔ کبھی شکل دیکھی اپنی۔ اس کی سوچ بہت نفی تھی۔ ڈانس کی تربیت وہ مکمل کر چکی تھی اور اب وہ خود کو ماہر رقاصہ سمجھتی اس نے خود ہی اخبار سے ایڈریس نوٹ کر کے اسٹوڈیو کے چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ شروع میں تو چونکیدار نے اسے اندر بھی نہ گھسنے دیا مگر چونکہ رشوت ہر کسی کا منہ بند کر دیتی ہے۔ سو دور نجف نے بھی چونکیدار کی نفی کر م کر کے اندر تک رسائی پائی تھی۔



بچی تین دن کی تھی جب خادم حسین اسے لینے آیا۔ موقع ڈپارچ ہو چکی تھی۔ گھر تک آتے شام ہو گئی۔ فوزیہ نے بہت خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا مگر ایمن بھی کچھ رسی۔ بچی کا ابھی تک ہم بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ اپنے بعد اپنی بیٹی کا انور ہوا اسے بالکل اچھا نہیں لگا مگر پروا کے تھی جو ٹکڑہ کرتی۔ سلطان شاہ اب آتا جا تا اسے خبر نہ ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ اس روز بھی وہ بچی کو فیڈ کروانے کے بعد کپڑے چھینچ کر وا کے فارغ ہوئی تھی جب فوزیہ اندر چلی آئی۔

”بے بی کیسی ہے؟“ بچی کو اس سے لیتے ہوئے فوزیہ نے مسکرا کر سلسلہ کلام جاری کیا۔

”سنو آئین تم نے ابھی تک اس کا کچھ نام ہی نہیں رکھا۔“ ایمن جواب دے پائی اللہ آنکھوں میں دھند ضرور تیرنے لگی۔

”کچھ سوچا تو ہو گا۔“ فوزیہ نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا۔ جیسی آہستگی سے پوچھا تھا۔

”نہیں خیال نہیں آیا۔“ ایمن گہرا سانس بھر کے بولی۔

”چلو اب رکھو۔“

”نہیں تم رکھو اس کا نام۔“ ایمن نے غیر متوقع طور پر یہ ذمہ داری فوزیہ پر ڈال دی۔

”مجھے حنا کا نام بہت اچھا لگتا ہے۔ سوچا تھا۔“ فوزیہ خود گلائی کے سے انداز میں بولی۔

”بہت اچھا نام ہے چلو آج سے اس کا نام حنا ہوا۔ فوزیہ کیا تم اس کی ماں نہیں ہو پھر ایسا کیوں دیتی ہو۔ قدرت نے ہماری بیٹی کو دو ماما سے نوازا دیا ہے۔ ڈونٹ وری دیا اگر پاپا نے آپ کو نظر انداز کیا ماما ہیں نا۔“ وہ جھک کر بچی کو پیار کرتے ہوئے جانے کیوں نفی تھی۔ فوزیہ چپ سی رہ گئی۔

”فوزیہ تمہیں نہیں لگتا ہماری زندگی میں کسی چیز کی بہت کمی ہے۔“ اس کا انداز بہت کھویا کھویا تھا۔

”محبت۔“ فوزیہ مسکرائی۔

”نہیں عزت۔“ ایمن نے نفی میں سر ہلا کر کھینچ کر۔ ”اور جاتی ہو عورت محبت کے بغیر جی لیتی ہے مگر عزت کے بغیر نہیں کاش میں اتنی بہادر ہوتی کہ سلطان شاہ سے عزت کروا سکتی۔ جاتی ہو میں نے ان سے محبت کی ہے انہوں نے نہیں جواب میں دی۔ مجھے فرق نہیں پڑا اگر چہ میرا حق تھا مگر عزت عزت کے بغیر مجھے جینا نہیں آ رہا۔“

”ایمن پلیز۔“ فوزیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا کو با تسلی دینی چاہی مگر وہ اور بھی کھڑ گئی۔ ہاتھوں میں چہرہ دھانپ کر اس دشت سے روئی کفریہ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔



ایک طویل سلسلہ تھا۔ آزمائش پر آزمائشوں کا۔ استخوان در استخوان کا جسے عبور کرتی آتی تھی۔ گزرتے ہوئے سالہا سال کے بعد ترقی کرتے کرتے آج دور نجف ایک مشہور فلم ایکٹریس کی پرسنل سیکرٹری بن پائی تھی۔ کیا یہی تھا اس کا خواب یہ تھا اس کا کیرئیر جس کی خاطر اس نے جدوجہد کی تھی۔ ڈائیکٹروں کی تئیں کیں۔ پروڈیوسروں کے غمخیزے برداشت کیے اور ہر باری سب سے بڑی ستارہ جو پہلے ہی لٹ چکی تھی بار بار لاتی رہی۔ کتنی بے وقوف تھی وہ کس قدر نادان تھی۔ تصنع و بناوٹ گندی تھیں اور چمکتے چہروں کے پیچھے گھنڈے کے کردار۔ کس قدر تھک گئی تھی وہ۔ جو چاہتا کیا اتنا مشکل تھا کہ پانہ سکی۔ اب جا کے اسے زیاں کا احساس ہوا تھا۔ اپنے ساتھ وہ کتنا بڑا کر چکی تھی، موٹی بھری ہر رسیدہ فلمی ہیروئن جن کے چہروں کی کمال بھی لٹک چکی تھی۔ وہ خوب صورت ٹوئز اور شاو اب تھی۔ پھر بھی ان کی بازو دریا بن کر تھی۔ وہ موٹی ہیروئن جس کی وہ سیکرٹری تھی۔ جب ہستی تو زور لے گا لگانا ہوتا۔ وہ ایک اپ کرتی تو دور نجف آئیہ بکارتی۔ یہ کیا تھا نصیب ہاں نصیب ہی ہو سکتا ہے۔ اب اسے مراد کے علاوہ ماں اور آپا کی بھی باتیں یاد آیا کرتیں جو کچھ پر مٹی تھیں اور اب اس کے تھکنا کا پانہ بچھل گیا ابھی سب کچھ چھوڑ چھا ڈر گھر بیٹھ گئی۔



ایمن حنا کو کات میں لٹا رہی تھی جب آہٹ پر پلٹ کر دیکھنے لگی۔ فوزیہ تھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”تمہیں بلار ہے ہیں۔“ اس اطلاع پر ایمن تھمسی فوزیہ کو دیکھنے لگی۔ آج وہ چاہہا تھا تھی۔ فوزیہ کے اصرار پر سالہی ہوئی تھی اور ایک اپ کر کے تیار بھی ہو گئی تھی۔ صرف فوزیہ کا دل رکھنے کی خاطر وہ دل تو بچھ کر رکھ رہا تھا۔ اس بلاوے سے اس پر حیرت کے ساتھ ساتھ انجانا سا خوف بھی مسلط ہو گیا۔ سلطان شاہ کی آخری ملاقات یاد آتی وہ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ابھی تک سلطان شاہ سے نزو اس کا سامنا ہوا تھا اور نہ ہی سلطان شاہ نے حنا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اگرچہ اس کے سامنے کے خیال نے ہی ایمن پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی مگر پھر بھی بظاہر رائل رہی بہت سے قیاس کرتے ہوئے اس نے جھک کر دوبارہ حنا کو بانہوں میں اٹھا لیا۔

”حنا کو نہیں چھوڑ جاؤ۔“ فوزیہ نے ٹوکا۔

”کیوں۔“ ایمن کی مسکرتی پیشانی پر پل پڑ گئے اسے بے حد کاواری محسوس ہوئی تھی جیسی تلخی سے پھاٹو کھانے کو دوڑی۔

”ایمن! تم تو جانتی ہو۔ پلیز غلامت سمجھو۔ مجھے کیا فائدہ ان کا موڈ آف کرنے کا۔“ فوزیہ نے رسوائیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ پھٹ پڑی تھی۔

”بس کرو فوزیہ! مت غصہ دلاؤ مجھے۔ کیا یہ اس شخص کی اولاد نہیں ہے۔ میں کیوں اسے کسی گناہ کی طرح چھپاؤں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے یہ بات میں نا صرف تم سے کہہ رہی ہوں بلکہ ان سے بھی کہہ دوں گی۔ اگر موڈ آف ہوتا ہے تو آئی ڈونٹ کیئر۔“ فوزیہ نے خاموش رہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

”جیسے کہہ رہی ہوں تم نہیں سمجھو گی۔“

ایمن حنا کو کاتھ لیے ہی سلطان شاہ کے روم تک آئی تھی۔ تاک کرنے کے بعد دھڑ سے اندر قدم رکھ دیے۔ سلطان شاہ اسی سمت توجہ تھا۔ ایمن کے قدم لمحہ بھر کو ڈگلا گئے۔ حنا کے خنہ وجود پر اس کی گرفت لا شعوری طور پر مضبوط ہو گئی اس کی سلگتی نگاہوں سے نگاہیں چراتے ہوئے خود کو سنبھالتی صوفے پر جا گئی۔ دراصل وہ اپنی گھبراہٹ اس پر عیاں ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”تمہیں یاد ہو گا میں نے کہا تھا اگر تم سے میری خواہش پوری نہ ہوئی تو میں سمجھوں گا۔ مجھے تمہاری بد دعا لگ گئی اور اس کی کوئی سزاوت پر چھوڑ دی تھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں سزا دی جائے مگر اس سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں اب بھی تمہاری سزا اٹھانے تن کر کھڑا ہوں۔ نہ میرا غور ٹوٹا ہے نہ ناقی خدمتہ کے بل گری ہے۔“ اس کے سر دلچھ میں رعونیت بھری تھی۔ ایمن اس فرعونیت کے مظاہرے پر قہر کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اٹھ کر ایمن کے قریب آن رکھا۔ ایمن دم ساوے بے حس و حرکت پھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”جانتی ہو میں کیا کرنے والا ہوں۔“ سلطان شاہ نے آتش کی نگاہوں سے اس کا وجود جھم کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ایمن لب بستہ رہی اس میں لپٹنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ سلطان شاہ زہر خند سے ہنسا پھر جھک کر نہایت بے دردی سے حنا کو اس کی کوڑے سے جھپٹ لیا۔ سوئی ہوئی بچی اس اچانک افتاد پر نیند سے بیدار ہو کر بلکنے لگی اور جیسے ایمن کا سکتہ بھی ٹوٹا تھا وہ ڈپ کر اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ سلطان شاہ سے کچھ کہتی اس کی سرخراہٹ پر بھونچکی رہ گئی۔

”میں نے نا وہ سادگی جو جو بڑی ہو کر میرا سر جھکا ئے گی یا مجھے کسی بھی طور کسی امتحان سے دوچار کرے گی۔ مجھے دینا چاہیے تھا تمہاری بد دعا کے اثر سے بچی ہوئی جو کہ مجھے نہیں چاہیے۔ میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“ ایمن اس کی سغا کی پرستار پالرزنگی اسے لگا تھا سلطان شاہ محض دھمکی نہیں دے رہا اس کی آنکھوں میں آرتا خون اس کی دردنگی کا نماز تھا۔ ایمن نے جھرجھرا کر نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”نہیں نہیں سلطان شاہ! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ آپ کا خون ہے۔ آپ کی بیٹی ہے۔ پلیز اسے مجھے دے دیں مم۔“ وہ بات مکمل نہ کی تھی اس کا گلہ بندہ گھا تھا بلند آواز سے روتے ہوئے سلطان شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ سلطان شاہ پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ بچی ایمن کی پہنچ سے دور تھی اور سلطان شاہ جانے اس کا گلہ دیا رہا تھا کہ بچی بری طرح تروپ رہی تھی۔ ایمن کوئی چارہ نہ پا کر جیسے جنونی ہو گئی۔ سلطان شاہ کے فوادی سینے پر کے مارتے ہوئے اسے جھنجھوڑتے ہوئے بلکنے لگی تھی۔

”چھوڑ دو چھوڑ دو میری بچی کو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میرے حال پر رحم کرو۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔“ وہ دھڑا لیں مارتے ہوئے حال سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ سلطان شاہ کے وجود کو جیسے خفہ سا جھٹکا لگا تھا۔ دشت جنوں غرور ایک حوالے پاتے ہی جھنجھٹا اٹھا۔ خدا کا واسطہ یہی کہا تھا ایمن نے۔ اس کے اندر ابلتا لاوہ جیسے غم گیا۔ حنا کو صوفے پر ڈال کر وہ رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ ایمن ٹھٹھکی تھی اور سخت خوفزدہ چہووں سے صوفے کی سمت دیکھا۔ حنا تیزی سے ہاتھ پاؤں پلاتے ہوئے دوری تھی۔ ایمن کے اندر دم توڑتی امید جیسے بھر سے جی اٹھی۔ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس نے حنا کا ہاتھ سا وجود پائی بانہوں میں بھر لیا اور برقی آنکھوں سے اس کے زندہ ہونے کا یقین کرتی اسے چومنے لگی جبکہ سلطان شاہ اپنے اندر چھلنے والی جگ سے جیسے خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے تیزی سے واش روم میں گھس گیا۔



ماں کی محبت بہت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ دور نجف کی پامیت اور فسادگی کو دیکھتے ہوئے اب انہوں نے اسے کھلم کھلا ارام دینا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایک دم سے

لاؤنج میں ٹیٹری ریڈیو پکڑے چھپ چل بدل رہی تھی۔ فوزیہ اسامہ اور عشنا کو سلائے بیڈروم میں جا چکی تھی۔ سلطان شاہ کی گاڑی کی آواز امین نے وہیں بیٹھنے کی آہٹ بھر جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ اٹھی۔ سلطان شاہ کو کہیں سے گزر کر اپنے بیڈروم میں جا رہا تھا۔ اس نے دانستہ آواز کا ولیم بڑھا دیا۔ خوب صورت میوزک کے ساتھ منگنی دلکش آواز سنا لے میں دور تک بکھر نے لگی۔

سلطان شاہ کے قدموں کی آہٹ محسوس کر کے امین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بہت اعتماد سے مسکرا دی۔ سلطان شاہ کے وہ چہرہ پھر سے پر خستہ ناگواری کا تاثر ابھرا تھا۔ اس نے گھور کر امین کو دیکھا اور اسے کچھ کہنے کی بجائے کرنل کا نازک گلہ ان اٹھا کر ٹی وی پر دے مارا ایک چھٹا کہہ ہوا تھا اور گلہ ان کے ساتھ ساتھ ٹی وی اسکرین بھی کرچوں کی صورت بکھر گئی۔ سلطان شاہ نے لب بکھینچے تیرہ قدموں سمیت اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ امین ہونق سی وہیں بیٹھی اس کے انتہائی رد عمل کی وجہ سوچتی رہ گئی۔

امین جس وقت سلطان شاہ کے بیڈروم کی سمت آئی۔ خادم حسین اسی وقت باہر آیا تھا۔

”اسلام علیکم بی بی جی۔“ خادم حسین نے نظریں جھکا کر سلام کیا۔

”وعلیکم اسلام آگے واپس تم۔“ اس نے انہر ہر مت پوچھا۔

”بی بی جی۔“ خادم حسین نے مسکرا کر کہا۔ امین سر ہلاتی سلطان شاہ کے دروازے پر دستک دیتی اندر داخل ہو گئی۔ سلطان شاہ کہیں جانے کو تیار تھا۔ وائٹ پیٹ کوٹ میں اس کا دروازہ پر باغضب کی مردانگی سیٹے ٹکا ٹھٹھکا کر دے رہا تھا۔

”میں ماما سے ملنے ان کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ کچھ دیر تک اس کی توہجی خطر رہنے کے بعد نا کامی کا پتہ ہو دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر سلگ کر بیٹھنے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ خود کو اہم کی تمہید میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”جاؤ لیکن بے بی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ سلطان شاہ کا روڈ لوجی بیٹھ کی طرح فیصلہ کن اور قطعیت سے بھر پور تھا۔

”لیکن یہ ظلم ہے۔ اتنی چھوٹی پکی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ اس نے بھر پور احتجاج کیا۔

”تم بہت کوڑھ مغر ہو۔ اسامہ کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اگر وہ رہ سکتا ہے تو بے بی بھی رہ لے گی۔ اسے تمہاری قطعی ضرورت نہیں۔ اس بھول میں مت رہنا۔“ امین اس کے سر پر ہر بیگانے انداز پر دانستہ ہیں کر رہ گئی۔

”تم جاؤ ڈرائیور نہیں چھوڑو گے گا اور اب وہاں رہنے کے جب بھر کے ارمان پورے کرنا۔“ سلطان شاہ نے ہنوز اسی اگڑے ہوئے انداز میں فیصلہ سنایا۔ گویا اب مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔ امین نے بھر پور احتجاجی ٹھٹھکوں سے اس بے حس قسم کو دیکھا تھا جس پر کسی شے کا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ اس پتھر سے سر پھولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سوائے اپنے آپ کو لبوہان کرنے کے سوچ چاپ اپنی تیاری کر کے ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔ اسے یقین تھا عشنا اس کے بغیر نہیں رہ پائے گی اور سلطان شاہ کو ہی جھک کر اسے بلانا پڑے گا یہ خیال گویا اس کے لیے تقویت کا باعث تھا۔

امین کے جانے سے عشنا ڈسٹرب ہوئی تھی اگرچہ فوزیہ اس کی بھر پور کیر کرتی مگر پھر بھی عشنا کی طبیعت سنبھل نہیں رہی تھی۔ یہ بات سلطان شاہ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ جیسی اس نے خادم حسین کو طلب کر کے یہ مسئلہ حل کرنا چاہا۔

”خادم حسین! بے بی کے لیے کونسی کی ضرورت ہے کوشش کر فوری انتظام ہو جائے۔“

”یہ اتنا ہی مسئلہ نہیں ہے میں اپنی گھر والی کو لے آتا ہوں وہ سنبھال لے گی۔“ خادم حسین کی فراخ دلانہ پائیکلش نے سلطان شاہ کو محضے میں ڈال دیا۔

”تم سمجھتے نہیں خادم حسین! مجھے بے بی کے لیے پورے کھلی سمجھدار کونسی کی ضرورت ہے جو اس کی اچھی طرح کیر کر سکے۔“ خادم حسین ماکہ کے تذبذب کی وجہ سمجھ گیا۔

”سرکار بے فکر رہیں وہ بھی پڑھی لکھی اور شہر کی رہنے والی ہے۔ اگر آپ حکم کریں تو میں۔۔۔۔۔“

”خیال برا نہیں تم اسے لے آؤ پلو عارضی جیسے ہی کسی اچھی کونسی کا انتظام ہوا اسے اجازت ہوگی واپس جانے کی۔“ سلطان شاہ نے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے خادم حسین سے اتفاق کر لیا۔ خادم حسین سر جھکا کر اجازت پاتے ہی رخصت ہو گیا۔



اپنے شوہر کے ساتھ وہ جس جگہ کے سامنے ٹیکسی سے تری تھی۔ اس عالی شان عمارت کی خوب صورتی کا مقابلہ آس پاس کی کوئی عمارت نہیں کر رہی تھی۔ اس کے شوہر نے بتایا تھا۔ یہ علاقہ اس کے ماکہ کے گھر کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے شوہر کا ماکہ اس شہر کا سب سے بڑا بزنس مین مشہور تھا۔ سفید ماربل کی جگہ گاتی ہوئی وہ دلکش عمارت جس کی ترجیحی سرخ چھتیں دھوپ میں چمکتے ہوئے بہت دلربا تاثر دے رہی تھیں۔ سیاہ آہنی گیٹ پر موجود گارڈ نے اس کے شوہر کو سلام کر کے علیک سلیک کی تھی۔ درجنف کی ٹچا ہن اطراف میں بھٹک رہی تھیں۔ اپنی سابقہ زندگی میں اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسین گھر دیکھے تھے مگر اس حد تک آڑٹھک گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ خوبوں کے ٹیش گل کی طرح ہی جگہ گاتا ہوا کو ایک شاہکار تھا۔ عمارت کے چاروں طرف نظر ٹکا پھیلا سبز لان تھا جس میں سوئنگ پول اس لان کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث تھا۔ بڑے ٹیکس گھاس کے فرش پر وائٹ چیزز کے ساتھ رکھے میز بہت بڑے معلوم ہو رہے تھے۔ اس پر قسم رنگ رنگے میٹھے ہوئے ہر موسم کے پھول درجنف خواب سی کیفیت میں چلتی رہی۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر سوچا تھا لان اس قدر خوب صورت ہے تو گھر کیسا ہوگا۔ اور اندر آتے ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا شوہر ہر روت کو اڑ میں لے جانے کی بجائے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

”تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ درجنف جھنجھکی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس گھر کے ماکہ کے رومٹ کی بیوی تھی۔ جانے ماکہ کس طبیعت کا تھا۔ اس کی اس بے تکلفی کو پسند بھی کرنا نہیں اس کا دل جانے کیوں یہاں آکر ٹھل سا ہو گیا۔ عجیب سی یا سیت اس کے گرد حصار باندھنے لگی۔ باہر لان کو دیکھتے ہوئے ان نے سوچا تھا۔ گھر کتنا خوب صورت ہوگا۔ مگر اب ڈرائنگ روم کی آرائش اس کی تو جب کھینچنے میں کام رہی۔ اس کی یا سیت میں ڈوبی خالی ٹچا ہن ایک ایک شے پر بھٹکتی رہیں۔ اپنے شوہر کے منہ سے اس نے بار بار اپنے ماکہ کی تعریفیں سنی تھیں۔ اس جیسا اچھ اور گوار بندہ بہت محبت و احترام سے اپنے ماکہ کا ذکر کرتا تھا۔ تب درجنف نے جانا تھا اسے بھی کسی سے محبت تھی۔ اور وہ بھی کسی کی عزت کرتا ہے۔ یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ اس جیسا غلیظ آدمی بھی محبت اور احترام سے واقف ہے۔ ہر شے سے لپکتی امارت از خود کو اس دے رہی تھی انہیں اپنے گھر میں جانے والا کس قدر با حیثیت ہے۔ انتھار کی کوفت سے بچنے کی خاطر وہ پھر سے اطراف میں موجود اشیاء کا جائزہ لینے لگی اور جیسے اس کی ٹیکس ساکت ہوئی تھیں۔ دل اچھل کر طاق میں اٹھ گیا۔ سامنے ہی دیوار پر آویزاں وہ جیوسائز انٹارنر شدہ فوٹو گراف اسے طوفان کی زد پر کھینچ لیا۔ اسے لگا سائیل ٹیم گئی ہوں۔ وقت کی رفتار رک گئی ہو۔ سمندر گلیشیر میں بدل گیا ہو پرنڈے اپنی اڑان بھول گئے ہوں۔ ٹچا جیسے پلٹنا بھول گئی تھی اس پر وقت کھین آیا تھا۔ یا یہ بھی اس کا الوٹن تھا۔ سامنے آویزاں تصویر مراد احمد کی وہی مسکراتی گہری آنکھیں وہی بھید گئی کے حصار میں خاموش لب وہی خوب رو باوقار پھر درجنف بے تاب ناٹھی تھی اور دیوانہ وار لپکتی ہوئی تصویر کے پاس آتے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے لفتوش کو محسوس کرنا چاہتا تھا مگر جانے کیا ہو گیا۔ شاید اس کے شوہر نے بد اعلاقت کی تھی کہ بولکھاہٹ میں ہاتھ کھینچ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر فریم لہر کر نیچے آیا اور دیوار کے ساتھ رکھے بڑے گلہ ان سے ٹکرا پاش پاش ہو کر کارپنٹ پر بکھر گیا۔ درجنف کی گھبراہٹ پر وحشت سوار ہو گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ بے سادستہ سسکی تھی۔

”مہر او۔“ اس کے کپکپاتے لبوں سے بھی نام نکھر رہا تھا۔

”ارے جاہلی عورت یہ کیا غضب کر دیا تو نے بد ذات! کمبختی تجھے معلوم بھی ہے یہ سرکار کا فوٹو تھا۔ کیا تم نے ان کا فوٹو فریم توڑ ڈالا۔“ خادم حسین غراٹا ہوا آنکھوں میں خون لیے اسے جان سے مار دینے کے ارادے سے لپکا تھا۔ بھی سلطان شاہ کی گھبر آواز پر یوں تھا جیسے کسی کھلونے سے سیل نکال دیا جائے۔

”جی سرکار کم۔“ خود کو نظر درجنف پر ڈال کر وہ لپچہ بدلے ہوئے عاجز اندہ لڑ میں لپٹا سلطان شاہ کی سمت چلا۔ درجنف نے اس کی اس زہریلی ٹچا ہن پر دھیان نہیں دیا۔ اب تو وہ سسکے کے عالم میں گل سسکی سامنے کیچ رہی تھی۔ جو پہلے سے کہیں بڑھ کر دلکش اور خوبو نظر آ رہا تھا۔ گز رہے ہوئے وقت نے گویا اسے مزید نکھار بخش دیا تھا۔ جسم پہلے سے بھی نیا دہ چوڑا اور مضبوط ہو گیا تھا۔ آج ہر سول بعد وہ چہرہ سامنے تھا جسے گزرتے ماہ سال میں شعوری یا لاشعوری طور پر وہ چہرے میں تلاشی آئی تھی۔ جو ملا تو کب جب کچھ باقی نہ رہا ملا تو کہاں کہاں گمان تک نہ تھا اس کا دل کو ای دے رہا تھا یہ مراد تھا اس کا مراد اس ایک چہرے کو تو وہ کرہوڑوں کے مجمع میں بھی آنکھیں بند کر کے پوچھان لیتی گھر نہیں یہ مراد کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو سلطان شاہ تھا جو خادم حسین اس کے شوہر کا ماکہ تھا۔ محبوب ماکہ جسے وہ بہت لاؤ محبت سے سرکار کہا کرتا تھا۔ درجنف اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ سلطان شاہ نے بھی اسے دیکھا تھا مگر اس ٹچا ہن میں کیا تھا وہ سمجھ نہ پائی۔ بے لگائی لاطعلقی! اجنبیت یا پھر نفرت اس کے احساسات بری طرح مفلوج ہوئے تھے جیسی وہ کسی ایک خیال پر متفق نہ ہو پائی۔ سلطان شاہ خادم حسین سے مخاطب تھا اور درجنف اس کے گھبر لہجے کی خوب صورتی میں گم ہوئی جا رہی تھی۔

”خادم حسین! بے جان چیزیں انسانوں کے احساسات سے زیادہ قیمتی نہیں ہو کر تیں اور جو چیز دولت سے حاصل ہو جائے چاہے کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اسے کبھی بھی انسانی احساسات پر فوقیت نہ دو۔ ملازمہ کو بلا دو یہ کچھ اوصاف کر دے گی۔“

”جی سرکار! حاضر۔“ تصویر ٹیبل پر رکھ کر خادم حسین باہر نکلا تو سلطان شاہ نے بھی قدم بڑھا دیے تھی گویا درجنف کے ساکت وجود میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ رت پ کر اس کے پیچھے لپکی۔

”مراد بلیز پلیز مراد۔ میری بات سنیں۔“ سلطان شاہ کے قدم اس صند پر جیسے زمین میں دھنس گئے وہ رکھ رہا تھا مگر پلٹا نہیں۔

”مراد او امر لیم تم ہونا۔“ رت پ کر اس کے سامنے آتے ہوئے وہ لپکی آنکھوں سمیت سسکی۔ ”ہاں یہ تم ہو۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔“ سلطان شاہ کا چہرہ رپاٹ رہا ہر جذبے سے عاری اس کی ٹچا ہن دیوار پر مرکوز رہیں۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ درجنف کے دل پر جیسے کاری ضرب پڑی تھی۔

”پتہ ہے مراد او۔۔۔ میں نے تمہیں کتنا اذیت دینا شروع کر دی ہے میں تمہیں یاد کر کے۔“

”مراد احمد! روز مر گیا تھا جس روز درجنف سے اس نے تمام تعلق توڑ دے تھے۔ تم کس مراد کو اذیت دے رہی ہو۔ میں سلطان شاہ ہوں اور سلطان شاہ کسی مراد احمد سے واقف نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ از حد تلخی سموئے بے زار سا تھا ایک دم پلٹا تھا اور بڑے بڑے قدم اٹھا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ جبکہ درجنف حقیر کے اس کاری وار کو نہ سہتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بے بسی سے رو دی۔

تم تو اگر یونہی سروراء مجھ سے ملو ہو

میں وہ اپنی اب پہلے سے بہت بدل گیا ہوں
 کبھی بارشیں ہوں تو گھر سے باہر نہیں نکلتا
 چاندروں کے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیتا
 میں نے سستی ہی غلط اور محبت کرنے والی لڑکیوں کے دلوں کو توڑا ہے
 کہیں کوئی گیت سنائی دے
 تو اونچی آواز میں اپنے آپ سے گنگو شروع کر دیتا ہوں
 کوئی بچہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑے تو اسے سہارا نہیں دیتا
 کسی مایا یا ضعیف کو سڑک کے کنارے محتاجی کے عالم میں
 کھڑے دیکھ کر بے اعتنائی سے گزر جاتا ہوں
 دیکھو کیسی کیسی تبدیلیاں آ گئی ہیں مجھ میں
 کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید ایسا کبھی نہ ہوتا اگر
 میں اپنے دل میں تمہاری محبت کے دکھ کو زندہ رہنے دیتا

سلطان شاہ نے سید فرحت شاہ کی کتاب بند کر کے نیکے پروال دی۔ ایک طویل سرد آہ اس کے لبوں سے آزاد ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ پچھلے ایک دن اور ایک رات سے وہ کمرے میں بند جیسے خود کو بھی بھولا ہوا تھا۔ درجنف کو خادم حسین کی بیوی کے روپ میں سامنے پا کر بھی جیسے برسوں کی بھرتی آگ دم نہ ہوئی بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منتشر ہو رہے۔ بس سا ہو گیا تھا۔ لیورنگ آنکھوں میں وحشت کی سرخیاں پھیل رہی تھیں۔ اس کی اک اک اور اسے خطرناک جھلک رہا تھا۔ فوزیہ اس کی پریشانی بھانپ گئی تھی اور اب حد درجہ بے قراری محسوس کر رہی تھی مگر اندر جانے اور اسے مخاطب کرنے کی ہمت تھی نہ جرأت۔ اسے یہ بات حیران کر رہی تھی۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو بھی طلب نہیں کیا تھا۔ فوزیہ عشا کو فیزہ کروانے کے بعد اب اسامہ کو کھانا کھلا رہی تھی مگر اس کی بے دھیانی سے ظاہر ہو رہا تھا اس وقت تو جہ کہیں اور ہے۔ ابھی سلطان شاہ اپنے کمرے سے نکل کر پوریلو کی جانب جانا نظر آیا۔ فوزیہ با سرعت اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگ گئی مگر تب تک وہ گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔ فوزیہ سختی سانس بھر کے رہ گئی۔ پلٹ کر اسامہ کے بجائے سلطان شاہ کے بیڈروم میں آئی تھی مگر اندر داخل ہوتے ہی چکر لگی کر وہ ابھی تک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوزیہ کو اپنا دم اکٹا ہوا محسوس ہوا ابھی گھبرا کر پردے کھینچتے ہوئے در پینے کھول ڈالے۔ سورج کی چمکدار شعاعیں کمرے کے اندھیرے کو گل گئیں۔ بے فکری بستر اس کی شب بیداری کا غماز تھا۔ فوزیہ کا دل دکھ کے شدید احساس سے بوجھل ہو گیا۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی سلطان شاہ پر کیا قیامت ٹوٹی ہے البتہ وہ ساتھی کی اس بے قراری کو ضرور جان گئی۔ کمرے کی حالت درست کرتے ہوئے اس کا دل اندر دنگی سے بوجھل ہوا جا رہا تھا۔



خادم حسین گاؤں آیا تھا اور رات گزار کر واپس جا رہا تھا۔ ابھی درجنف نے اسے پکارا تھا۔

”یہ لے جائیں۔“
 ”کیا ہے یہ کس کو خط لکھتی ہے اور کیا ختم کوٹنے ڈاکیا بھی لاری۔“ وہ اس پر چڑھ رہا تھا۔ درجنف نے لبوں کا کونڈا اتوں سے داب کر بے دردی سے کھل ڈالا۔
 ”یہ خط آپ اپنے مالک کو دے دیجیے۔ میرا مطلب ہے سرکار کو۔“ درجنف نے فوری وضاحت کی اور پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ خادم حسین کا غصہ پل میں ہو ا ہوا تھا۔ خط کو جب میں ڈالتے ہوئے اس کے ذہن میں شک کا کوئی ناگ نہیں بلبلا یا۔ جانے اسے اپنے مالک پر اندھا دھند بھروسہ تھا کہ بیوی سے یہ وجہ پوچھنا کو ارنہ کیا تو یہ خط انہیں کیوں لکھ رہی ہے۔ درجنف بھی اس کے اندر سے اعتماد کو پا گئی تھی ابھی بہت ہمت کر کے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ سلطان شاہ نے ابھی کچھ دیر قبل ہی فوزیہ کو ڈانٹ کر بھیجا تھا۔

”اگر دوبارہ ادھر کارخ کیا تو ناگسٹوں توڑ دوں گا۔“ فوزیہ سہم کر طپ گئی تھی۔ پیپر کائن کے سرخی شلوار سوٹ میں بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کی مانند دیکھی آنکھیں لیے یہ اس سلطان شاہ سے قطعی مختلف نظر آ رہا تھا جس سے اس کے جانے والے واقف تھے۔ خادم حسین کے دل پر کاری ضرب لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دروازہ بجا کر بے آواز قدموں سے اندر چلا آیا تھا۔ سلطان شاہ جانے کہاں گم تھا کہ اس کی آمد سے آگاہ نہ ہو پا پا اب جو اس نے پکارا تو چونک کر انٹنی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ خادم حسین کا دل جیسے ٹھوکر کھا کر رہ گیا۔

”سرکار گستاخی معاف، کوئی خطا ہو گئی کہ آپ نے ناچیز کو خدمت کا موقع نہیں دیا۔“ خادم حسین ہاتھ باندھے سخت روپاسا ہو کر کہہ رہا تھا۔ سلطان شاہ نے اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ کٹر کر رخ پھیر لیا۔ بھاری لہجے میں بولا۔

”کچھ نہیں خادم حسین! ابھی تم جاؤ۔ جب تمہاری ضرورت ہوگی بلو الوں گا۔“ خادم حسین پوری طرح خوش نہ ہو پا پا وہ جان چکا تھا اس کا مالک کسی بہت بڑی تکلیف میں ہے۔ جب سے وہ اس کے ساتھ تھا آج تک اسے اتنا ملنا نہ ہو اکٹھا محسوس کیا تھا۔ اس کا نہیں چل رہا تھا اپنے مالک کے دکھ سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتا۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو نود کھڑے دیکھ کر سوالیہ نگاہوں سے تنکا ”آج تک ایسا نہ ہوا تھا کہ سلطان شاہ نے حکم دیا ہو اور خادم حسین ایک پل کی تاخیر کرے اس کی سرخ آنکھوں ہوتی آنکھوں میں حیرانگی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

”سرکار! گستاخی معاف آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر کو بلا دوں۔“ خادم حسین تذبذب کا شکار رہشگی سے اپنی تفتیش ظاہر کر گیا۔ سلطان شاہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”اس کی ضرورت نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں تم جاؤ۔“

”سرکار! معاف کیجیے کیا میں آپ کے پاس رکوں۔“ خادم حسین مضطرب سا بولا۔ سلطان شاہ اب کے جواب دیے بنا اس پر وقتی مخصوص سر دھکا ڈال گیا۔ کوپا جتا رہا تھا تم اپنی حد کر اس کر رہے ہو۔ خادم حسین گڑبڑا کر سر جھکا گیا۔ دروازے کی جانب جاتے ہوئے جیسے کچھ یاد کر کے خود کو کوستا ہوا پلاتا تھا۔

”سرکار! معافی چاہتا ہوں یہ آپ کے لیے ہے میری گھروالی نے دیا ہے۔ کہہ رہی تھی آپ کو لازمی چھوڑ دوں۔ سرکار لگتا ہے اپنی اس روز والی غلطی کی معافی مانگی ہے۔ نقصان بھی تو بہت بڑا کیا تھا اس نے۔“ کھد اس کی جانب بڑھا جاتے ہوئے خادم حسین بتا رہا تھا۔ جبکہ سلطان شاہ تو ایک لفظ پر انگ گیا ”نقصان“ اس نے اذیت سے آنکھیں تختی سے بند کر لیں مگر خادم حسین کی آواز کا کیا کرنا بصورت اسرائیل کی طرح کانوں کے پردے چھاڑے۔ ماتوں میں گھسی ملی آ رہی تھی۔

”ویسے سرکار! میں نے بہت ٹھکانا کی اس کی۔ محسوس کو مانی یاد آگئی ہوگی۔“ سلطان شاہ کا چہرہ اس انکشاف پر تاریک ہوا تھا۔ فوراً رخ موڑتے ہوئے اس نے چہرے پر اندر تے تاثر کو خادم حسین کی زیرک نگاہوں سے محفوظ کیا تھا۔ پچلا پل دانتوں تلے اس شدت سے دبایا کہ خون کا ڈانڈہ منہ میں محسوس ہونے لگا۔

”سرکار! اگر آپ نہیں پڑھنا چاہتے تو میں آگ میں جھونک دوں گا۔“ اس کے یوں رخ پھیرنے پر خادم حسین نے جو محسوس کیا اس کے مطابق کو یا اسے خوش کرنے کی خواہش کی۔

”اسے رکھ دو خادم حسین اور تم جاؤ۔“ سلطان شاہ نے بوجھل لہجے میں کہا تب خادم حسین نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر حکم کی تعمیل کی تھی۔

سلطان شاہ مضطرب نہ کمرے میں پکرا رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں گاہے گاہے نیل پر رکھے اس مفید لفافے سے اٹھ رہی تھیں۔ خادم حسین صبح سے یہ خط لے گیا تھا اور اب شام ڈھل آئی تھی۔ تب سے سلطان شاہ نہ باہر نکلا اور نہ کسی کو اندر آنے کی اجازت ملی۔ مسلسل چلنے کے باعث ناگسٹیں شل ہو رہی تھیں۔ خط پر ہکا بھکا ڈالتے ہی وہ جیسے اندر سے کھل جاتا۔ برسوں سے چھایا جو ڈھونڈ لگتا۔ دل مضطرب ہو کر جہان کی طرح سخت سلطان شاہ کو پگھلانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔

”کھلو پھو پھو دیکھو تو سہی کیا لکھا ہے۔ اس لپس کو محسوس کرو جیسے تم نے زندہ کیا جانا۔“ اور سلطان شاہ خود سے تو خائف ہو گیا تھا۔ اسے اپنا لمبا نیڑا مضبوط سراپا اس وقت ایک نئے سچے کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ جو بے حد خوفزدہ تھا۔ سخت سہا ہوا جانے اس بند لفافے کو کھولنے سے کیا کیا انکشاف ہوتے۔ شاید وہ منجبال نہ پانے خود کو ڈھسے جائے مجروح کیا کرے گا۔ صبح سے یہی جنگ چھڑی تھی اندر بھی سلطان شاہ نے ٹھکے ٹھکے انداز میں خود کو صوفے پر گر ادیا اور جیسے کسی منطقی نتیجے پر پہنچ کر خط اٹھا لیا لفافہ چاک کرتے ہوئے ان مضبوط ہاتھوں میں واضح لٹریچر لڑائی تھی پر چھل چکا تھا۔ سلطان شاہ کی بے تاب نگاہیں سطروں پر پھیلنے لگیں۔

کل	شب	میں	نے	گلی	میں	موت	کو	دیکھا
وہ	بالکل	اس	زندگی	تھی	جیسی	رہا	ہوں	
جیسی	زندگی	میں	تمہارے	بغیر	جی	رہا	ہوں	

السلام علیکم!

خدا سے دعا ہے آپ کو زمانے کی تمام خوشیاں نصیب ہوں (آمین)۔

مراد احمد یا سلطان شاہ سوچتی ہوں زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے کہ آپ کو مخاطب کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی ہوں۔ میری زندگی میں آپ مراد احمد بن کر داخل ہوئے اور کوپا بہاروں نے میرے گھر پر ڈیر ڈال لیا مگر میری بد نصیبی خبر چھوڑتی ہوں یہاں ذکر بھر انہیں آپ کا ہوگا۔ آپ چونکہ خادم حسین کے مالک ہیں اور وہ آپ کو بہت چاہ اور احترام سے سرکار کہتا ہے۔ کیا میں بھی لیکن نہیں میں تو اس قائل بھی نہیں کہ آپ کو مخاطب کر سکوں۔ سلطان شاہ شاید آپ یہ خط پڑھے بغیر ہی چاڑوں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خادم حسین سے وصول ہی نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے میرے خدشات غلط ثابت ہوں اور آپ یہ خط پڑھ کر میری التجا پوری نہ کریں سب کچھ ممکن ہے اور آپ کو قہقہے ہی اپنی مرضی کرنے کا۔ خادم حسین آپ سے بہت محبت کرتا ہے اور بہت متاثر بھی ہے آپ کی شخصیت سے شاید ہر محبت اپنے محبوب کو اسی طرح فالو کرتا ہوگا۔ جس طرح آپ کو خادم حسین ہاں سلطان شاہ وہ آپ کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ ان چند دلوں میں اس نے مجھ سے جواب بھی کی اس میں آپ کا ذکر شامل تھا اور آپ کی زندگی کو میں اسی قدر جانے لگی جس قدر وہ جانتا ہے۔ دکھ اس بات کا ہے سلطان شاہ آپ تو ایک آئینہ بل مرد تھے۔ یہ کون سی روش اپنائی۔ کیوں خود کو برباد کر ڈالا۔ موت سے کھیلتے ہیں صرف پیسے کی خاطر۔ اور آہ سلطان شاہ وہ گرہن جو کسی پہ نہیں کل سکیں انہیں میں نے ہی بانٹ دیا۔ مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ آپ پہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ آپ نے میری سوچ سے بڑھ کر توقع سے کہیں زیادہ دولت جمع کر لی ہے مگر سکون کیوں گواہ اور میں جانتی ہوں یہاں بھی ذمہ دار میں ہوں۔ سلطان شاہ جانے آپ نے زندگی میں کبھی مجھ سے سامنا ہوا جانے اور مجھ جتنے کی خواہش میں یہ سب کیا ہے یا نہیں لیکن تقدیر نے جہاں اور بہت سے مقام پر مجھے میری غلطی اور زیادتی کا احساس دلایا۔ وہاں آپ کے دور پر بھی لے آئی لیکن مجھے لگتا جیسے یہاں آ میرا بے مقصد نہیں تھا۔

قدرت کے اس کام میں مصلحت پوشیدہ ہے، جیسی میں آج آپ سے مخاطب ہونے کی جرأت کر رہی ہوں۔ آپ کو یاد ہے اس روز آپ نے خادم حسین سے کہا تھا ہے جان چیزیں انسانی احساسات سے زیادہ قیمتی نہیں ہوا کرتیں جو چیز دولت سے حاصل ہو جائے چاہے وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اسے کبھی بھی انسانی ٹیلنگ پر فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ جانے میں خوش فہمی کے ثبوت میں ذہن ہو کر ایسا سوچتی ہوں کہ آپ کو خادم حسین کے ہمراہ ساتھ رکھنے کے سلوک نے ہرٹ کیا تھا۔ جیسی آپ نے ایسا کیا۔ ورنہ جیسے خادم حسین نے آپ کو شکوایا ہے اس کے مطابق اب آپ کے پاس ایسے احساسات کا گزر بھی نہیں کہنے کا مقصد یہ ہے آپ میرا انتقام دوسری عورتوں سے بلکہ ہر عورت سے کیوں لے رہے ہیں۔ آپ نے روشادیاں کر لی ہیں اور ان کے ساتھ آپ کا رویہ بے حد غیر مناسب ہے۔ ایک گئی بات بتاؤں آپ کو سلطان شاہ ہماری سرزمین کی خوش نصیبی یا اللہ کا کرم سمجھ لیں کہ یہاں نانوںے فیدہ عورتیں مل جاتا اور وفا جیں۔ سو میں سے ایک عورت تھجھجی بے وفا ذلیل ہوتی ہے جو معاشرے میں کسی غلطی گالی کی مانند بن کر رہ جاتی ہے۔ مقدور کی سیاحتی بن کر آپ جیسے باکردار مرد کی مسیح پینٹائی پر کا لک بن کر چپک جاتی ہے اور آپ کی بد نصیبی آپ کے حصے میں وہی عورت آتی۔ اس ایک عورت کو معاف نہ کریں سلطان شاہ لیکن باقی کی معصوم عورتوں کو بھی جبر اس کیلنگی میں شامل نہ کریں۔ سلطان شاہ سوچئے غور کریں کیا آپ کے تمام مظالم اور اور کو بھی جانے والی کج ادائیگوں کے باوجود وہ دونوں عورتیں آپ سے محبت نہیں کرتیں۔ جنہیں اب آپ کی دیوایا ہونے کا اعتراف کرنا چاہئے۔ آپ کے ساتھ وہ فانیس ہمارا ہیں۔ کیا انہوں نے آپ کے بچوں کو ختم نہیں دیا۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ نے انہیں درجنف کی جگہ کیوں رکھ دیا۔ آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ جاتے کہ آپ کی زندگی میں آنے والا ہر ساتھی بے وفا نہیں ہے۔ بس اک جتن ہی ہر جانی تھا جو اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ جانتے ہیں سلطان شاہ کل خادم حسین مجھے بہت تنگ میں تارہا تھا کہ اس کے سرکار چھوٹی بی بی کے بعد ایک اور شادی بھی کریں گے۔ صرف چھوٹی بی بی کو بچا دکھانے کی خاطر اور جو سرکار سے گستاخی کرتا ہے وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دیکھا آپ نے سلطان شاہ اپنی محبت کے رویوں کا حال ان کی اپنی سوچ سمجھ ہی نہیں رہی۔ کبھی آپ اپنی آنکھوں سے نفرت کی چادر ہٹا کر فو ز یہ بی بی اور امین بی بی کو دیکھئے پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ جو عورت کا تار کی اور روٹنی کا فرق مان لیں۔ وہ درجنف نہیں ہیں۔ وفا کی دیوایا ہیں۔ جتنوں سے ہجر سے دل رکھنے والی۔ سلطان شاہ آپ سے گزارش ہے اگر آپ کے دل میں اب درجنف کے لیے ذرا ہجر بھی محبت ہے تو اپنی محبت کا واسطہ دے کر اچھا کرتی ہوں تمام برائیوں کو چھوڑ دیجئے۔ فو ز یہ امین کی جانب لوٹ جائے۔ آپ کا گھوٹا ہوا سکون مل جائے گا۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔ خدا ضرور معاف کرے گا کہ آپ نے درجنف کی طرح بڑے بڑے گناہ تو نہیں کیے۔ اس کے باوجود مجھے رب سے مایوسی نہیں وہ ضرور معاف کرے گا یہ میرا دل کو اسی دے رہا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں اب میں آپ پر کوئی حق نہیں رکھتی نہ ہی مجھے آپ سے کہنا چاہیے مگر سلطان شاہ درجنف نے ساری زندگی صرف گناہ کیے ہیں۔ ایک نیکی کما چاہتی ہے اگر ہو سکے تو اس کی مدد کیجئے۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے میری وجہ سے ہی یہ آپ میٹ ہوا ہے۔ اور اب میں اپنا بویا کاٹ رہی ہوں۔ جب سے جب سے آپ سے جدا ہوئی آپ کی بہتری کی خواہش مند۔

بد نصیب درجنف

خاتم ہو چکا تھا۔ سلطان شاہ نے کانڈ مٹھی میں سمجھ کر لبوں سے چھریا آنکھوں سے بہتا سیال چہرے کو بھگو چکا تھا۔ ہاں وہ سلطان شاہ رو رہا تھا جو تب بھی نہیں رو رہا تھا جب اس نے درجنف کو خود سے الگ کیا تھا اور نہ تب جب درجنف نے اس کی لولا کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ یہ دکھ اس کے اپنے دکھ تھے۔ اور وہ کمزور تھا نہ دل مرد تھا۔ پھر کیسے رو لیتا جیسی دل پر آنسو گر کر آنکھوں کو خشک چھوڑ دیا لیکن اب وہ مضبوط نہ کر سکا تھا نہ ہی برداشت کیونکہ یہ دکھ درجنف کا تھا۔ وہ اپنے لیے کب رو رہا تھا۔



درجنف کو طلاق دینے کے بعد مراد گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہاں جانا ہے۔ نہ منزل کا پتہ تھا نہ راستوں کا علم۔ شاید جب محبت روٹتی ہے تو ہر شے ہی آنکھیں پھیر لیا کرتی ہے۔ دل زندگی سے ایک دم ہی اچاٹ ہوا تھا۔ بے پناہ شاک ہوا تھا کہ بھلا کیا لگاڑا تھا میں نے کسی کا جو میرے ساتھ ایسا ہوا۔ اس وقت وہ اس بچے کی طرح روٹھا ہوا تھا جس سے اس کا سب سے پسندیدہ کھلوں چھین گیا ہوا۔ اتنے بڑے دکھ پر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہائے مگر یہ ستم ہی تو تھا اتنی بڑی دنیا میں سب پرائے تھے۔ بعض اوقات غم کی شدت میں بھی آنکھیں خشک رہتی ہیں۔ دل پر آنسو گرتے رہتے ہیں اور اسے ناکارہ کر جاتے ہیں مراد احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ وہ بہت ساروں چاہتا تھا مگر نہ پایا اور یہ بوجھ پیسے دل پر گھبر گیا تھا۔ عجب بے رونق اور سنا آتر آتا تھا۔ ہر سوبہ راستے اس کے لیے اجنبی تو نہ تھے مگر کس قدر بے گامگی سے اسے تک رہے تھے۔ ناگہم وجود کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہو گئیں جب وہ اہلس قریبی پارک کی جانب آ گیا۔ دن کب گزرا رات آئی اسے خبر نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کی طرح اب ہر شے تاریک اور پرالٹ تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ رات کا جانے کون سا پھر تھا جب پولیس کی گشتی پارٹی نے اسے دھر لیا۔ مختلف سوال ہوئے تھے۔ جن کا جواب وہ ضرور دیتا اگر دماغ حاضر ہوتا مگر گریہ کی شکلیں دیکھتا رہا۔ کانٹیل نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر سب کچھ تھیلانے کے بعد موبائل میں بٹھایا اور لا کر حوالت میں بند کر دیا۔ وہ تب بھی سمجھ رہا تھا۔ تین دن بے یار و مددگار حوالت میں بند رہا۔ کون تھا جو اسے چھڑانے آتا۔ پولیس بھی جانے بھول گئی پھر وہیں حوالت میں کمال عرف کوئے نے زبردستی اس سے روٹی گانٹنے کی کوشش کی۔ مگر مراد نے یہاں بھی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ کمال عرف کو حوالت سے لگا تو ساتھ ہی مراد کی بھی شناخت کروادی۔ پولیس کے ساتھ کمرے کے اچھے تعلقات تھے یہ تو بس دینا دکھاوے کو کو کوٹیل میں بند کیا گیا تھا پھر کوئے نے مراد کی جان نہیں چھوڑی۔ وہ جوئے کا اڈا چلاتا تھا اور مراد میں اسے جانے کیا نظر آیا کہ اسے اپنے ساتھ کام میں شریک کرنے پر مصر ہو گیا۔ مراد چونکہ نظریاتیک اور شریف تھا سو صاف انکار کر دیا۔ وہ اس خالی اور ویران گھر میں لوٹ آیا مگر گریہ نہ ہونے کے باعث جلد ہی اس مکان کو خالی کرنا پڑا۔ باب سے بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی جگہ بنا بندہ رکھ لیا گیا تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں لاوارث ہوا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا درجنف کی بخشی ہوئی فقر توں کے حصار میں وہ دل گرفتہ سا بچھا تھا کہ کوئے نے آکر چڑکا دیا۔ مراد نے ناکواری کا اظہار کرنا چاہا تو کو خباثت سے نہیں دیا۔

”ہمیں انکار کرنے سے پہلے پیار سے اپنے پیاروں کو سوچ لو۔ تمہیں ہر صورت میرے ساتھ شامل ہونا ہے ورنہ میں تمہاری فیملی کو رات کے وقت۔۔۔“ مراد چونک گیا۔

”کون میری فیملی۔ میرا کوئی نہیں ہے میں تنہا ہوں۔“ اس کے انکار پر کوئے ہنسا تھا اور کتنی دیر تک ہنستا رہا۔

”پیار سے نہیں نہیں، بھلاؤ کیا تمہاری ماں نہیں ہے۔ دو بھائی اور تین بہنیں نہیں ہیں۔ ہم جیسے لوگ جس پر ایک نظر ڈال لیں اس کی کمزوریوں کو سب سے پہلے قابو کرتے ہیں۔ بول اب کام کرے گا پھر تیری بہنوں کو لے آئیں ایک رات کے لیے اپنے اڑے پر۔“ مراد جو کب سے لب سمجھنے ہوئے تھا مزید برداشت نہ کر سکا اس کا غیرت مند خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ ایک لمحہ لگا تھا اور اگلے ہی لمب وہ کوئی دھنائی میں مصروف تھا۔ کوئے نے چپ چاپ اس کے گھونے کو پیچ کر کھالے جب وہ اپنے لگا تب اسے شانوں سے تمام کر دو بارہ بٹھاتے ہوئے ہونٹوں سے اپنا ہونٹ صاف کرتا ہوا بولا۔

”بہنیں چیز بہت اچھی لگی نہیں تمہاری۔ صرف خوب صورت نہیں ہو۔ شریک کی مانند طاقتور بھی ہو۔ یہ بات طے ہے تمہیں آتا ہی ہے۔ ایک رات ہے تمہارے پاس فیصلہ کرو۔ اگر ہمارے حق میں ہو تو اس پر پہنچ جانا ورنہ کل رات وہی ہو گا جس سے تمہیں اشتعال چڑھا ہے۔“ وہ ایک چٹ اس کے سامنے پھینک کر مڑا اور گردن موڑ کر اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”یہ بات ذہن میں رکھنا تمہارے انکار کی صورت میں پہلے تمہیں حوالت میں واپس کھجواؤں گا پھر اپنا کام کروں گا۔ ظاہر ہے کبھی ہمیں اپنے دانت تھوڑی تروانے ہیں۔“ وہ کہہ ہی ہنسا چلا گیا۔ مراد بچے سے انداز میں ہیل پر گر اٹھا اگرچہ اس کے سوتیلے بھتیگوں نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ چاہتا تو وہ بھی خود کو لالچ بنا کر بے نیاز ہو جاتا۔ مگر وہ تو بے غیرت تھا اور نہ ہی بے حس۔ پھر جیسے فیصلہ کرنا مشکل نہ رہا تھا اور وہ رات کا انتظار کیے بنا چٹ اٹھا کر اسی وقت چل پڑا۔ پھر وہ اس دلدل میں دھنسا چلا گیا۔ اسے درجنف کے آخری الفاظ یاد آتے تو جیسے دولت چھ کرنے کا جنون سر پر سوار ہو جاتا۔ شاید اگر دولت اس کے پاس ہوتی تو آج وہ نہ تھا ہوتا اور نہ ہی دیکھی۔ وہ دولت حاصل کرنے کی خاطر ہر جائز و ناجائز راستے پر چلنے لگا جو بھی اس کے مقابل آ جاتا۔ جیت نہ سکتا۔ اس کا نام جیت کی شناخت بن گیا۔ لڑکیاں اس کی چار رنگ پر سنائی پر دیوانہ وار تار تار ہوتیں وہ انہیں محبت کا چمکہ دیتا۔ جب وہ اس کی خاطر پاگل ہوئے لگتے تو چھوڑ دتا۔ اس طرح جانے وہ درجنف کا بدلہ چکار ہاتھ پاں یہ ضرور تھا کہ درجنف کے بعد وہ کسی عورت کے بھی اس قدر نزدیک نہ گیا تھا۔ اسے اس گناہ سے نفرت تھی جس گناہ میں مبتلا اس نے آرزو درجنف کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے اپنا نام بدل لیا تو مراد احمد جیسے کہیں کھو کر رہ گیا۔ ایک افشی کو اس نے اس حد تک کنگال کیا کہ وہ اپنا سب کچھ کھالے خالی ہو گیا جب اپنی بی بی اس کے سپرد کر دی۔ سلطان شاہ لڑکی کو پیسے کے بدلے رکھنا نہیں چاہتا تھا جیسی ہڈ سے لڑنے لگا۔ جب وہ لڑکی ان کے درمیان آگئی۔

”دیکھئے آپ مجھے شریف انسان لگتے ہیں۔ بابا نے مجھے آج آپ کے حوالے کیا ہے تو کل کسی اور کو دے دے گا۔ پلیز آپ مجھے رکھ لیں۔ میں آپ کے گھر ملازمہ بن کر رہ لوں گی۔“ سلطان شاہ پھر بھی آمادہ نہ ہوا تو بڑھا اپنی بی بی کو چھوڑ کر خود چلا گیا۔ اب سلطان شاہ اس کے باپ کی طرح بے غیرت نہ تھا کہ وہ بھی اسے گھر سے نکال دیتا۔ انہی دنوں خادم حسین نوکری کے سلسلے میں اس سے ملا تھا اور اس کا ہو کر رہ گیا۔ سلطان شاہ نے اس لڑکی فو ز یہ سے نکاح کر لیا۔ فو ز یہ اس کی احسان مند تھی اگرچہ وہ اسے باندی بنا کر رکھتا تھا۔ فو ز یہ اس میں بھی خوش تھی۔ چادر دیواری میں عزت تو محفوظ تھی۔ فو ز یہ اس کی زندگی میں مزید کامیابیوں کی شناخت بن کر داخل ہوئی تھی۔ ہر گزرتے دن نے سلطان شاہ کے لیے خوش قسمتی اور دولت کے دروازے کھولا شروع کر دیے۔ سلطان شاہ اب چھوٹے ہاتھ مارا پناہ نہیں کرتا تھا بڑے بڑے بھٹیوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنا بزنس ادارت کر لیا تو جیسے دن دوگی اور رات چوٹی ترقی کرنا آسمان کو چھوئے لگا۔ اب اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ تو وہ دنوں ختم ہو رہا تھا نہ غلغلہ مٹ رہی تھی۔ گزرتے وقت نے درجنف کی یادوں پر فراموشی کی ہر گز ادائی مگر وہ لاشعوری طور پر ہر عورت کو درجنف کے روپ میں دیکھتا تھا اور اسے عورت عورت کی بجائے ناگن نظر آتی۔ نہ بلی ناگن جو موقع ملے ہی ڈنٹے سے باز نہیں آتی جیسی سلطان شاہ الٹ رہا کرتا جہاں اسے عورت نظر آتی وہ ہی اسے ڈنٹے کا موقع دینے بنائی اس کا بچن کھل ڈالتا۔ سبھ دھور کے برے دن شروع ہو چکے تھے۔ کاروبار میں تیزی ان سے برداشت نہ ہوتی تو سلطان شاہ کو برنس پائز کی حیثیت سے کاروبار میں شامل کر لیا۔ سلطان شاہ عادت سے مجبور تھا۔ انہیں بھی جوئے کی مضمونی میں شامل کر لیا۔ اور تب ہی ایک روز اچانک امین سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کا غرور و نخوت اور طغیان سلطان شاہ سے برداشت نہ ہوا تو بچا دکھانے کو خصوصی پلاننگ کے بعد اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا اور اسے بچا دکھایا بھی اس کے بعد اسے قرا آ جانا چاہیے تھا مگر امین وہ واحد لڑکی تھی جس نے درجنف کے بعد سلطان شاہ کو بے بس کیا اور اپنی شکست سلطان شاہ سے کوارا نہ تھی جیسی مگر مایاں تیز کر ڈالیں۔ اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بارہا بویا بار گیا ہو۔ بھی بات سلطان شاہ کو مزہ نہ کرتی تھی۔ یہ اس کی انسلٹ تھی وہ بچا دکھانا جانتا تھا خود جھکا پناہ نہیں تھا درجنف کی گزارش پر اس نے غور کیا تھا تو حقیقت پوری سچائیوں سمیت روشن ہو گئی۔ فو ز یہ اور امین اس کی کسی نیکی کا ہی صلہ تھیں۔ وہ ان سے غافل نہ رہا تھا۔ ایک ایک حرکت سے واقف تھا۔ ان میں ان کے کردار میں کھل بھول نہ تھا واقعی درجنف نے کچھ لکھا تھا۔ اس کی قسمت میں بس اک جتن ہر جانی تھا اور وہ درجنف تھی۔



دشک دینے کے بعد خادم حسین اندر داخل ہوا تھا چہرہ اندرونی خوشی کے باعث جھمک کر رہا تھا۔ بہت دنوں بعد سلطان شاہ نے اسے طلب کر کے ڈھیروں کے حساب سے اس کا خون بڑھا دیا تھا۔

”سرکار! آپ نے یاد فرمایا۔“ خادم حسین نے مودبانہ انداز میں بولا مگر لہجہ چمکتا ہوا سا تھا۔

”ہاں خادم حسین! آؤ بیٹھو۔“

”جی سرکار۔“ خادم حسین بوکھلاہٹ میں اس کا منہ تکتے لگا جہاں وہی سپاٹ تاثر نہ تھا البتہ آنکھوں کی سرخی اس روز سے بھی کچھ گہری ہو رہی تھی۔ خادم حسین بے چارا ہوائی سارہ گیا۔ بھلا کبھی تصور بھی کیا تھا کہ وہاں تک کے برابر بیٹھ جانا ایسا تو وہ گستاخی میں شمار کرتا تھا۔

”بیٹھ جاؤ خادم حسین اور جو کچھ میں کہوں چاہے کچھ بھی ہو تمہیں کتنا بے اشاک کیوں نہ لگے لیکن تمہیں بولنا نہیں ہے۔ سمجھتے تم۔“ سلطان شاہ نے مخصوص لہجے میں حکم دیا۔ خادم حسین فرمانبرداری سے سر ہلانے لگا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر سرکار۔“ خادم حسین انکساری سے کہتا ہونے کے کنارے ٹک گیا۔

”آرام سے خادم حسین پر سکون ہو کر بیٹھو۔“ خادم حسین اس قدر توجہ پر بوکھلانے لگا۔ الٹی خبر یہ آج سرکار کو کیا ہو گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سلطان شاہ نے ہنظر اری انداز میں اس پر اپنی ابو رنگ آنکھیں جھرا کر پوچھا۔

”خادم حسین تقدیر پر یقین رکھتے ہو۔ تقدیر کیا ہے؟“ خادم حسین کو شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ منہ کھول کر سلطان شاہ کو دیکھنے لگا پھر اسے جواب کا ہنظر پایا تو گہری سوچا میں ڈوبتے ہوئے پر خیال انداز میں بولا تھا۔

”جی سرکار! تقدیر پر تو ہر مسلمان کو یقین ہے۔ خدا کے فیصلے ہی تقدیر کہلاتے ہیں۔“ سلطان شاہ جو غور سے دیکھ رہا تھا سر ادا بھر کے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھتا ہوا بولا۔

”ہاں خادم حسین خدا کی فیصلے جن سے انحراف انسانی بس میں نہیں یہی تقدیر کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات تقدیر انسانی زندگی سے منموڑنے پر انسانی ہے لیکن مرہا بھی تو اپنے بس میں نہیں ہم سب خدا کے بندے ہیں اور اسی کے محتاج بھی۔“ سلطان شاہ کھوکھوے کھوکھوے انداز میں کہہ رہا تھا جبکہ خادم حسین سست شدہ سانس سے دیکھ رہا تھا جس نے اس قسم کی باتیں کم از کم اس کے ساتھ کبھی نہیں کی تھیں۔

”یہ خدا کا فیصلہ ہی تو ہے خادم حسین کہ اس رحمن الرحیم نے اس زمین پر مجھے تمہارا مالک بنایا اور قسمت کے دشمنی تم ہی ہونا۔“ سلطان شاہ کے لہجے میں بہت کچھ کھونے کا کرب رچ گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

”مہم میں سمجھا نہیں سرکار!“ خادم حسین گھبراہٹ کا کھار ہو گیا۔ ”کوئی گستاخی ہو گئی مجھ سے سرکار!“ اس نے زرد پڑتی رنگت سے پوچھا۔ سلطان شاہ نے اپنی ہوائی کچھ خادم حسین پر ڈال کر چہرے کا رخ پھیر لیا۔

”نہیں آرام سے بیٹھو خادم حسین گستاخی تو میں نے کی ہے۔ خدا کی بے شمار نعمتیں اس کے آج کا دم کھڑا ہوں۔ کس منہ سے دوبارہ اس کے دوبار میں حاضر ہوں۔ دعا کرنا خادم حسین اللہ جھ جیسے گناہ کو بخش دے۔“ سلطان شاہ مضطرب سا ہو کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خادم حسین بھی اتر آنا اٹھا تھا جبکہ سلطان شاہ اب رخ پھیرے کھڑا تھا۔

”خادم حسین! میری تمہارے سامنے جو کچھ ہے اسے اٹھا لو اور اس شہر سے دور لڑی جگہ چلے جاؤ جہاں کبھی ہمارے ملنے کا امکان پیدا نہ ہو۔“ خادم حسین کے جسم پر اس حکم نے لرزہ طاری کر دیا۔ آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اسے کامل یقین ہو گیا انجانے میں کوئی خطا ضرور ہو گئی ہے جس کی سزا سرکار اس طرح دے رہے ہیں۔ وہ بے ساختہ تڑپ گیا۔

”مہم سرکار رحم۔“

”خادم حسین مجھے سرکار نہ کہا کرو۔ سلطان شاہ بھی تمہارے جیسا عام سادہ ہے۔“ سلطان شاہ رخ پھیرے پھیرے بولا۔ خادم حسین کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سلطان شاہ کی تنبیہ یاد آگئی۔ سچی چپ رہا۔

”یہ جو فائل ہے اس میں میرے دوسرے گھر کے کاغذات ہیں جو میں نے تمہارے نام کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ سر سیدز کی چابی بھی اٹھا لو فائل میں ایک چیک ہے جس میں تین کروڑ کی رقم بھری ہے۔ کش کرو لیتا۔ وہ بنگلہ اور کار آج تمہاری ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارا مذہب میں بہت سے سوال ٹھل رہے ہوں گے مگر کچھ بھی مت پوچھنا بعض اوقات بے خبری میں بھی بہت بڑی فوٹ اور اصول دولت ثابت ہو کرتی ہے اور جو کچھ میں نے کہا اس پر عمل کرنا اور ایک بات اسے چاہے میرا حکم مان لیتا چاہے التجا مگر ماننا ضرور۔ عورت کی عزت کرنا سمجھو بیوی کی بھی۔ خادم حسین بیوی عزت اور محبت کے قائل ہوا کرتی ہے۔ اسے پاؤں کی جوتی سمجھنے والے ذلیل ذکور ہو کر رہتے ہیں کہ عورت عظیم درجے پر فائز رہی ہے۔ بیوی ویلوں کو ختم دینے والی بھی عورت تھی۔ خادم حسین تم سن رہے ہونا۔ آئندہ تم بیوی کو وہ عزت ضرور دو گے جو اس کا جائز حق ہے اور آئندہ اپنی بیوی کو کبھی گالی مت دینا۔ اور اسے اس دنیا کی ہر آسائش دینا جس کی وہ تمنا کرے۔ خادم حسین پلیز اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس بات کو گھر میں باندھ لو۔ اب چلے جاؤ۔“

خادم حسین اب بچکیوں سے رو رہا تھا۔ سلطان شاہ کے اس قطعی فیصلے نے اس کا دل تو لڑا دیا تھا۔ وہ واقعی اس سے عشق کرتا تھا اور سلطان شاہ کے محض ایک اشارے پر گردن بھی کٹا سکتا تھا۔ وہ کو کیا اس کے جانے کا ہنظر تھا۔ خادم حسین سست روی سے آگے بڑھا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”سرکار! کوئی گستاخی ہوئی ہے تو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں مگر یہ سزا مت دیں۔ خادم حسین مرجائے گا۔“ سلطان شاہ جھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

”خادم حسین اٹھو۔“ وہ سخت برہم نظر آئے۔ ”تم جانتے ہو تم نے کوئی گستاخی نہیں کی لیکن اب تم گستاخی کر رہے ہو۔ میری نہیں خدا کی جانتے ہو خدا کو اپنے سوا کسی اور کے آگے جھکنے والا پسند نہیں۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں لیکن اس فیصلے کی وجہیں بتاؤں گا۔ اب تم جاؤ۔“ خادم حسین آنکھیں پونچھتا ہوا اٹھا اور ٹھیل پر دھری فائل اور چابی اٹھالی۔ اب سوائے حکم کی تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ خادم حسین مالک کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دل سے راضی نہ تھا ایک بار پھر خادم حسین نے درمیانی فاصلہ گھٹنا کر قریب آتے ہی سلطان شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولیں سے لگا لیا۔

”سرکار! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹا تیزی سے باہر نکل گیا۔ سلطان شاہ نے خود کو تہا پاتے ہی ہاتھوں میں سر تھام کر خود کو صوفے پر گر ادیا۔ میں جانتا تھا خادم حسین میرے ایک اشارے پر تمہیں آزاد کر دیتا اور یوں آسانی سے میں تمہیں اپنا سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا میں جانتا ہوں عورت اس مرحلے سے گزرنے میں کس قدر ٹوٹ کر نکھرتی ہے۔ جب میں نے تمہیں چھوڑا تھا تو تمہاری نفرت میں خود کو پور پور زہر بلا محسوس کیا تھا اور پھر واقعی تمہارا انتقام دوسری عورتوں سے لیتا رہا لیکن آج میں سوچوں کہ غلط اگر تم تھیں تو درست میں بھی نہیں تھا۔ سب کچھ جو میں نے تمہاری وجہ سے جمع کیا۔ وہ یہ سوچ کر تمہیں دیا ہے کہ مجھے واقعی آج بھی تم سے محبت ہے۔ خدا کرے تم خوش رہو اور میں پر سکون ہو سکوں۔ تمہیں شاید یاد ہو میں نے تم سے وعدہ کیا تھا تمام آسائشیں دینے کا میں نے وہ وعدہ بھرا دیا ہے اسے احسان نہیں محبت سمجھ کر قبول کر لیتا۔ تم سے دوبارہ مل کر میں نے محسوس کیا محبت جدائی کی آگ میں سلگتی ہے بھڑکنی ہے تو آس پاس چنگاریاں اڑا کر کچھ نہ کچھ برباد ضرور کرتی ہے۔ مگر پھر بھی محبت نفرت میں کبھی نہیں بدلتی۔ محبت یا تو محبت ہوتی ہے یا پھر نہیں محبت مرنی نہیں ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں تمہاری محبت آج بھی میرے دل میں زندہ ہے۔



ایمن کو آئے چند دن ہوئے تھے۔ جب سلطان شاہ کی لازماً ڈرائیور کے ساتھ آکر حشنا کو اس کے حوالے کر گئی تھی۔ ایمن کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ اپنے تئیں گیند اپنے کورٹ میں کرکٹ بھی کھی اور ہنظر تھی اس بلاوے کی گرتہ پیرانی ہو گئی تھی وہ لہر سے بچھ کر رہ گئی۔ حشنا کو یاد کرتے ہوئے اس نے خود کو مای کی تھی۔

”سنو تمہارے صاحب نے شادی کر لی؟“ دھک کی جانے کو نین سرحد عبور کر کے ایمن نے ملازمہ سے استفسار کیا۔ ملازمہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم بولتی کیوں نہیں۔“ اسے غصہ آگیا۔

”چھوٹی بی بی جی! صاحب تو شادی کر چکے ہیں آپ سے اور فوزیہ بی بی سے۔“ ملازمہ پریشان سی ہو کر بولی۔

”وہ شہت جاؤ تم۔“ ایمن نے چڑکھتا ہوا لہر دوام ہو گئے تھے اسے یہاں آئے اب اسے خود پر غصہ آگے لگا تھا۔ کیا میں جانتی نہیں تھی اس کنکور شخص کو پھر کیوں بے وفائی کی۔ اب کیا کروں اس کا دل بھرا لے جا رہا تھا۔ خود سے جانا تو سر اس پرانی تلخ لعل کے مترادف تھا اور یہاں کی طور قرار نہیں تھا۔

لونا	سکون	دل	کیوں	ہمارا	جواب	وو
کب	ہم	نے	کیا	ہمارا	جواب	وو
ب	ہم	کو	بھی	میر	نہیں	ہمیں
کیا	ہو گیا	ہے	تم	خدا را	جواب	وو

فوزیہ ٹھیل پر کہیاں نکاتے سامنے پڑے ایک کو یا سیت بھری کچھ بولیں سے ٹک رہی تھی۔ ایک کے گرد کینڈل روشن تھی جس کی ٹپٹائی ہوئی لوفوزیہ کی آنکھوں میں موجوں کو کھلانا لگی تھی ایک بار اتفاقاً طور پر فوزیہ نے سلطان شاہ کے شناختی کارڈ پر اس کی ڈیٹ آف رتھ دیکھ لی تھی اور جیسے ہیٹھ کے لیے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی۔ ہر سال وہ اپنے طور پر ایک کاٹ کر اس دن کو منایا کرتی تھی۔ اس بار بھی وہ بھولی نہیں تھی۔ وہی اہتمام بھی کیا تھا سادہ اطمینان اور خوشی مغفوقی۔ غمزدگی نے جب سے اس کے دل پر ڈیرے ڈال رکھے تھے جب سے سلطان شاہ کو ڈسٹرب دیکھ رہی تھی۔ جنہیں چاہا جاتا ہے ان کی پریشانی اور دکھ کو دیکھنا سب سے نکھن اور دشوار گزار ہو کرتا ہے۔ سلطان شاہ کی وہی روٹھن تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت کمرے میں ہی گزارتا تھا فوزیہ نے آج تک اسے اتنا اپ سیت کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی وہ کبھی اتنا قنوطی اور خود سے لاپرواہ ہوا تھا۔ سلطان شاہ تو ہمہ وقت اکیلو اور بڑی رہا کرتا تھا۔ اب جانے اتنا فارغ وقت کہاں سے آگیا تھا کہ کمرے سے ہی نہ نکلتا وہ جتنا سوچتی اسی قدر اذیت محسوس کرنے لگی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی اس نے اسامہ کو سلا یا تھا اور خود یہاں آگئی تھی۔ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں گھرے رہنے کے بعد اس نے بے دلی سے چھری اٹھائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک پرچائی کرے کا نیم تار یک ماحول یک دم تیز روشنیوں سے نہا گیا۔ فوزیہ نے چمک کر سر ہونچا کیا۔ آف وائٹ کائن کے کلف دار شلوار سوٹ میں اپنی ٹھک کا ویسے ولی رعب دار شخصیت سمیت وہ چلتا ہوا اس کے پاس آن رکا۔

”تم یہاں تھیں میں نے پورے گھر میں تلاش کر لیا۔“

